بیگم انیس قدوائی

نظرے خوش گزرے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

نئی اور اہم مطبوعات

رموزِ غالب	ڈاکٹر گیان چند	۱۸/۵۰
میر امن سے تعارف	صالحہ عابد حسین	۴/۰
اقبال اور مغربی مفکرین	جگن ناتھ آزاد	۱۰/۵۰
جدید اردو ادب	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/۰
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۱۳/۰
کچھ نثر میں بھی	آنند نرائن ملا	۱۴/۰
بازگشت	بشیر احمد جائسی	۱۱/۰
عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا	محمود الحسن	۱۵/۰
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ: عبداللطیف اعظمی	۱۲/۵۰
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۴/۰
نیا اردو نصاب (اول)	مرتبہ: محمد ذاکر	۳/۰
نیا اردو نصاب (دوم)	مرتبہ: قیصر زیدی، محمد ذاکر	۳/۰
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	۶/۰
بیاضِ مریم	سکندر علی وجد	۱۲/۰
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۳۲/۰
مغلیہ ہندوستان میں زرعی تعلقات	سید نور الحسن	۴/۰
سماجی تبدیلیاں از منۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں	رام شرن شرما	۲/۰
قدیم دلی کالج	مالک رام	۴/۵۰
انتخاب حالی	مرتبہ: سفارش حسین رضوی	۶/۵۰
یادوں کے سائے	شفیق صدیقی	۱۸/۰
تلاش میر	نثار احمد فاروقی	۱۱/۰
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکانِ ثلاثہ	ضیاء الحسن فاروقی	۴/۰
مذہب اور جدید ذہن	ڈاکٹر مشیر الحق	۶/۵۰
غالب اور شاہانِ تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	۹/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/۰
جانے والوں کی یاد آتی ہے	صالحہ عابد حسین	۱۶/۰
مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	۱۲/۵۰
وہ صورتیں الٰہی	مالک رام	۱۶/۰
دہلی اور اس کا پس منظر	مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی	۴/۰
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	۱۲/۵۰
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	۹/۰
طنزیات و مضحکات	رشید احمد صدیقی	۱۰/۵۰

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی

© انیس قدوائی ۱۹۷۶ء

صدر دفتر:۔

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دلّی 110025

شاخیں:۔

اردو بازار دہلی 110006

پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 202001

یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ 400003

پہلی بار مارچ ۱۹۷۶ء

قیمت -/۱۲ روپے

(نعمانی پرنٹنگ پریس دہلی)

پیش لفظ

یادش بخیر! عبدالوالی صاحب مرحوم ایک رسالہ "معلومات" لکھنؤ سے غالباً ۱۹۱۸ء تک نکالتے رہے تھے۔ اس میں میرے والد (ولایت علی بمبوق) کا مضمون "بیوی کیسی ہونی چاہیے" شائع ہوا تھا۔ کسی اور صاحب نے بھی اس عنوان پر طبع آزمائی فرمائی تھی۔ میں نے وہ رسالہ اپنی ماں کے پاس دیکھا۔ دونوں مضامین پڑھے۔ میرے والد کا خیال تھا کہ بیوی کو موت کے نام سے ناآشنا ہونا چاہیے نیز وہ اتنی مختصر ہو کہ ہر وقت جیب و دل کے قریں رہے دوسرے صاحب کا خیال تھا کہ سریع الحس اور موسمی ہونا چاہیے۔ اُن کا فرمان تھا کہ "زنِ نو کُن اے دوست ہر نوبہار"

بہرحال یہ مضامین تھے جنھوں نے شوہروں کی قسمیں قلم سے نکلوائیں۔ اتفاق سے ۱۹۳۱ء میں 'معلومات' کا دوبارہ اجرا ہوا اور والی صاحب نے پہلی یا دوسری اشاعت میں اس مضمون کو شائع کیا۔ مگر 'معلومات' چند ہی دن زندہ رہ سکا اور ۱۹۳۶ء میں جب اس عنوان پر چودھری محمد علی مرحوم نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے تقریر نشر کی تو میں نے اس میں ضروری اضافے کے بعد "بیوی کیسی ہونی چاہیے" کے جواب میں "شوہروں کی قسمیں" ریڈیو سے نشر کر دیں۔

اس مجموعے کے کچھ مضامین آل انڈیا ریڈیو کے دیے ہوئے عنوانات پر نشر ہوئے ہیں۔ کچھ مختلف ادبی محفلوں میں پڑھے گئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو

اور جامعہ ملیہ کے ادبی اجتماعات میں اکثر شعرائے کرام اور غالب پر طبع آزمائی کرنے کا موقع ملا اور جب واہ واہ کے ڈونگرے برس گئے تو اپنے دماغ میں ان فضولیات کی بھی ذرا اہمیت پیدا ہو گئی اور ساتھ ہی ترتیب و اشاعت کا خیال بھی پیدا ہو گیا۔

مگر فطری لاابالی پن، بلکہ پھوہڑپن نے کبھی اس کا سلیقہ ہی نہ دیا کہ ان اوراقِ منتشر کو یکجا کروں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بھول بھال میں نہ جانے کتنے ضائع ہو گئے۔ آخر کار شمس الرحمٰن محسنی اور رشید نعمانی صاحب کے اصرار سے ایک بار ان کو نقل کر دینے کی نوبت آ ہی گئی اور اب شاہد علی خاں صاحب کی مہربانی ہے کہ یہ مطبوعہ اوراق کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم، اردو ادب کو ان سے کتنا فائدہ ہو گا، کتنا نقصان! میرا لکھنے کو دل چاہا، میں نے لکھا بغیر سود و زیاں کے اندازے کے۔ جب جی گھبرایا، کچھ لکھ ڈالا۔

زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار کا یہی راستہ مجھے ہمیشہ نظر آیا اور دلی سکون اسی سے حاصل ہوا، بہر حال خوش رہنے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کون ہو سکتا تھا کہ کسی پہ ہنسو، اپنے آپ پر ہنسو۔ اپنے پر اور دوسروں پر طنز و مزاح کے تیر چلاؤ اور پھر آہستہ آہستہ چوٹ کی کسک محسوس کرو۔ یہ ذرا عجیب سی بات قارئین کو لگے گی، مگر یہ سچائی ہے جسے کہہ دینے میں مجھے کوئی جھجک نہیں ہو رہی ہے، میری زبان قصباتی ہے اودھ کے قصبات میں ہندی اور فارسی الفاظ کا ایک خوبصورت ملا جلا، لغت و ڈکشنری سے مستثنیٰ تلفظ رائج تھا۔ مضامین میں اہلِ زبان کو چند لفظ غیر

مانوس سے نظر آئیں گے کیونکہ یہ مسودہ جن دنوں تاباں صاحب کے پاس پڑا ہوا تھا تو انھوں نے بھی یہی کہا تھا کہ بہت سے الفاظ مبہم اور غیر مانوس ہیں۔ میرا خیال ہے، قارئین کو اس کی پروا نہ کرنی چاہیے۔ اگر معنی و مفہوم اور سلاست و روانی میں فرق نہیں آتا تو ڈکشنری میں نہیں، عوام کے منہ سے ان الفاظ کی تصدیق کر کے ان کی جامعیت و لطافت کا اندازہ کر لیجیے۔ عام طور پر شعرا پر تنقید کرنے والے فن و تاثر اور گہرائی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مگر یہ سب نقادانِ سخن کو ہی زیب دیتا ہے۔ نقد و تبصرے کے لیے علم و فضل کی ضرورت ہوتی ہے اور میری سطحی تعلیم اور گھریلو زندگی اس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی، اس لیے میں نے ہر شاعر اور ادیب کو اس کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ جو جھلک اپنے کو نظر آئی، پیش کر دی اور یہ سوچ لیا کہ آپ نے یہ حلیہ کبھی نہ دیکھا ہو گا۔

کچھ مضامین محض خیالی ہیں، مگر تاریخی حقائق، موجودہ ماحول، کہنہ رواسم اور نئی تہذیب کا مکسچر بنا کر ناظرین کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مکسچر کڑوا کسیلا ضرور ہے مگر فرحت بخش، اس لیے مجھے امید ہے، وقتی سرور تو ضرور حاصل ہو جائے گا۔

اپنی بے ترتیبی سے اس میں شخصیات پر بھی دو تین مضامین شامل کر دیے، جن کی جگہ دوسرے مجموعے میں تھی۔ بہر حال اس پہلے اڈیشن میں ان کو سہارا لیجیے۔ اگر کبھی دوسرا اڈیشن نکلنے کی نوبت آئی تو دیکھا جائے گا۔

ناشکری ہو گی اگر میں ڈاکٹر عابد حسین اور صالحہ حسین کی محبت و خلوص کا تذکرہ نہ کروں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے ان اول جلول صفحات کو اول و آخر بنانے کی کوشش کی اور غلطیوں

کو سنوارا ۔ اور پھر منیجر مکتبہ جامعہ کی حکمت بھی قابل داد ہے جو ایک جلد بندھی ہوئی صاف ستھری کتاب آپ کو پیش کر رہے ہیں ۔

انیس قدوائی

فہرست

	پیش لفظ	۳
۱۔	امیر خسرو	۹
۲۔	غالب ایک فیچر	۱۶
۳	حکیم مومن خاں مومن	۲۴
۴۔	کیا مولانا آزاد کبھی بچہ تھے	۳۳
۵۔	شاستری جی	۴۱
۶۔	سجاد ظہیر کی سالگرہ کے موقع پر	۴۴
۷۔	صالحہ عابد حسین	۴۹
۸۔	حسن مسرت ہے یا غم	۵۴
۹۔	ریختی	۶۰
۱۰۔	سرشار اور ان کے ناول	۶۹
۱۱۔	نظیر پر ایک نظرے خوش گذرے	۷۸
۱۲۔	مرزا غالب ۔ گپ شپ	۸۹
۱۳۔	رسوائیاں	۹۶
۱۴۔	منشی پریم چند اور ان کے ناول	۱۰۳
۱۵۔	اردو ادب پر روسی اثر	۱۱۲

۱۶- اقبال اور عورت ۱۳۰
۱۷- آدھ گھنٹہ بزم ادب میں ۱۴۱
۱۸- غالب اپنے آئینے میں ۱۵۰
۱۹- وہ کون تھیں ۱۶۶
۲۰- تنہا اکیلا ۱۸۰
۲۱- شوہروں کی قسمیں ۱۹۰
۲۲- یہ مرد ۲۰۲

امیر خسرو

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانای راز آید بروں

دانایانِ راز کی آمد کا سلسلہ آفرینشِ علم سے اب تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ صدیوں کے اُلٹ پھیر میں ایسی کتنی ہی بلند شخصیتیں ملتی ہیں جنہوں نے حق و باطل، ظاہر و باطن، امن و جنگ، روشنی و ظلمت اور انسانیت و حیوانیت کے درمیان ہم آہنگی و توازن پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

ایسے تقریباً چھ سو سال پہلے ایک ایسی ہی ہستی کا ظہور دہلی کی سرزمین پر ہوا تھا، جس کی انگلیاں ہندوستان کی نبض پر تھیں۔ دلِ حق کے سامنے سربسجود، نظریں منشائے ایزدی کی طرف اور زبان اظہار صداقت و اصلاح خلق میں منہمک تھی۔ اس کے فقیرانہ دربار میں شاہانِ وقت لرزاں و ترساں آتے اور وہ خود ظالم و جابر حکمرانوں کے مظالم سہتا۔ عوام نے اس کے قدم چومے اور خواص نے اس کو رشک و حسد کا شکار بنایا، لیکن اس کا سینہ نورِ الوہیت اور خلقِ خدا کی محبت سے لبریز رہا اور وہ تھے حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ۔

مریدین و معتقدین کی طویل فہرست میں سرِفہرست حضرت امیر خسروؒ کا نام ستارے کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ علم و فضل اور شریعت و طریقت کے اس گروہ میں

خسرو اپنی انفرادی شان اور انوکھی آن کے ساتھ براجمان ہیں۔ نہ وہ خانقاہ میں فٹ ہوتے ہیں نہ دربار میں، نہ گویّوں کی محفل میں سجتے ہیں، نہ علماء و فضلاء کے ساتھ مسند نشین ہونا پسند کرتے ہیں۔ ان کو اپنے مرشد کے قدموں میں پڑا رہنے میں جو مزہ ملتا ہے، وہ مسند جانشینی یا امامت میں نہیں۔

اندر سے دیکھیے تو پورے صوفی باصفا۔ عشق الٰہی سے بھرپور۔ مگر سلوک کی منزلیں پیر کی خانقاہ میں نہیں طے ہوتیں۔ گاؤں گاؤں شہر شہر اسباب تجارت لادے ہوئے پھر رہے ہیں اور منازل راہ سلوک طے ہو رہی ہیں۔ نسبت، شاہِ دین و دنیا سے اور دربارداری تغلق و خلجی کی۔ وضع ظاہری عالمانہ، مگر اسی جبّہ و عمامہ سمیت حجّو کے ہاتھ سے حقہ بھی پی لیتے ہیں اور پنہاریوں کی فرمائش پر ڈھکوسلہ اور کہاوتیں بھی کہہ دیتے ہیں۔

مسلم الثبوت شاعر ہوتے ہوئے بھی رندوں میں نہیں، زاہدوں میں صدر نشیں بن جاتے ہیں۔ موسیقی میں اتنی مہارت ہے کہ گوپال نائک زانوئے ادب تہہ کرتا ہے۔ اور عوامیت کا یہ حال کہ ڈھولکی کی تال پر بول کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے کہا تو کسی اور کے لیے تھا، مگر ٹھیک خسرو کے لیے ہے۔

حسن آئینہ حق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

خسرو کے آئینے میں ہمیں اپنی خودی، کائنات کے رموز، الوہیت کے اسرار اور حیات انسانی کی رنگا رنگی سب کچھ نظر آ سکتی ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ خالص مذہبی عینک لگا کر نہ دیکھیے۔

نہ اتنا وقت ہے، نہ اتنی معلومات اور نہ کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں ہے کہ خسرو کے شجرۂ نسب سے لے کر آل اولاد تک، ہیں سب کچھ بیان کر جاؤں۔ جسے اس کی تلاش

ہو تاریخ پڑھے۔ اس وقت تو بس اس کی ضرورت ہے کہ چھ صدی پہلے کا اگر آپ تصور قائم کر سکتے ہوں تو شخصی حکومتوں کے جاہ و جلال اور فقر و درویشی کے درمیان ایک اچھوتا رنگین اور پاکیزہ راستہ نکالنے والے ایک ایسے شخص کا خیال کیجیے جو بادشاہوں کا مقرب، فقیروں کا محبوب، دربار کی رونق اور خانقاہ کی جان تھا۔ حال و قال کی محفلیں اور علماء و فضلاء کی بزم جس کی شکر ریزیوں سے معمور تھی۔ باطن میں عارفِ کامل ظاہر میں عالِم باعمل۔ زاہدوں کا رہبر اور رندوں کی جائے پناہ تھا۔ جس نے صحیح معنوں میں ہمیں بتایا کہ

چیست فُقرا ای بندگانِ آب و گِل
یک نگاہ راہ بیں یک زندہ دِل

خسرو کی حیثیت ایک بڑے حکیم کے عطّار اور مشیر کی سمجھیے۔ حکیم دوراں کی انگلیاں تو ہندوستان کی نبض پر تھیں اور کان دل کی حرکت سن رہے تھے۔ وہ تشخیصِ مرض کرتے۔ دوائیں تجویز کرتے اور خسرو معجون و عرق تیار کرتے تھے۔

مسلمان اس ملک میں ان دنوں نووارد تھے۔ سلطنت کو نہ مغل زمانے کی سی وسعت حاصل تھی، نہ استحکام۔ نوواردوں اور دیس کے باشندوں میں عداوت بھی تھی اور نفرت بھی۔ ایک دوسرے کے مذہب اخلاق اور کلچر سے ناواقف تھے۔ زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کے مذہبی جذبات اور علوم و فنون سے بھی بڑی حد تک بیگانہ تھے۔ حکیم وقت جانتا تھا کہ الگ تھلگ رہ کر بسر ہونی مشکل ہے۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ آنے والے آ ہی گئے۔ اب تو جینا مرنا یہیں ہے۔ سلطان المشائخ نرے کٹھ ملّا تو تھے نہیں۔ سوجھ بوجھ والے لوگ تھے۔ لودی، خلجی، تغلق، چوہان، راجپوت جنگجو، ملک گیری کے لیے کٹتے مرتے رہیں۔ عوام گیہوں گھن کی طرح پسیں۔ یہ تو اللہ کی مخلوق ہے۔ ان کے سینے تو ایک دوسرے کی محبت سے بھر دو۔ امن و محبت کے شیدائی نے اپنے شاگرد دل

میں سے خسرو کو چُنا۔ برج بھاشا اور فارسی میں تال میل پیدا کرنے کے لیے 'خالق باری' مرتب ہوئی۔ عورتوں تک بات کو پہنچانے کے لیے پہیلیاں، مکرنیاں، کہاوتیں، دوہے، دو سخنے اور ڈھکوسلے ترتیب دی گئیں۔

خسرو، نو واردوں اور مقامی باشندوں کے درمیان ایکتا اور محبت کی کڑی بن گئے۔ وہ راج دربار بھی جاتے، شہروں اور گلیوں میں بھی پھرتے۔ سنسکرت اور برج بھاشا کی مدد سے برہمنوں سے بھی ملتے اور عربی فارسی کے ذریعے علماء سے بھی۔ ایک زبان کی چیزیں، دوسری میں منتقل کرتے، ایک کے جذبات و خیالات دوسرے کے ذہن و دماغ تک پہنچاتے۔

مرشد کے پاؤں دباتے وقت بھی حقیقتیں ان کے گوش گذار کر دیتے تھے۔ کہتے ہیں ایک روز حضرت محبوب الٰہی صبح صبح چہل قدمی کو نکل پڑے۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ مندروں سے گھنٹے اور ناقوس کی صدائیں آ رہی تھیں اور مسجد سے موذن کی صدائے اللہ اکبر۔ وحدت الوجود کے پرستار پر اس وقت یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ الگ طریقوں، مختلف ناموں اور جُدا جُدا انداز سے اس ایک ازلی و ابدی طاقت کے سامنے سرنگوں ہے۔ حضرت نے کہا۔

خسرو۔ ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے۔

یعنی ہر قوم سیدھے راستے پر، ایک دین اور ایک ہی مرکز عبودیت رکھتی ہے۔

خسرو نے والہانہ انداز سے جواب دیا۔

من قبلہ راست کردم بر طرف کج کُلاہے

اور خود شاہِ کج کلاہ کا یہ عالم تھا کہ ایک بار مہرولی کے راستے میں ہندوؤں کے کسی تہوار، شاید بسنت پر ایک گروہ کو گاتے بجاتے دیکھا تو بھجن کے بول تیر بن کر دل میں اُتر گئے اور وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔

ظاہر ہے ہمہ اوست کے اس پجاری کو ملکی سیاست میں بہتا ہوا خونِ ناحق کیسا لگتا ہوگا اور امن و محبت کے یہ شیدائی کتنی کٹھن منزلوں سے گزر کر اپنی آواز فرمانروایانِ حکومت تک پہنچاتے ہوں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حضرت محبوب الٰہی نے امیر خسرو کی بد دلی اور اصرار کے باوجود ان کو دربار سے وابستہ رہنے پر مجبور کیا۔

امیر خسرو ان تمام کاموں میں ان کے دستِ راست بلکہ عملی معاون تھے۔ اگر سلطان جی کوئی سیاسی لیڈر ہوتے تو یقیناً خسرو کو علاؤالدین خلجی کا وزیر ہونا چاہیے تھا اور اگر حضرت جنگ و خونریزی ضروری سمجھتے تو خسرو کو تغلق کا کمانڈر انچیف ہونا چاہیے تھا۔ اور اگر حضرت خرقۂ خلافت تفویض کر دیتے تو جانشینی کا فخر ان کو حاصل ہو جاتا۔ لیکن ان میں سے کچھ بھی نہ ہوا۔ کیوں کہ خسرو عشقِ الٰہی اور عشقِ مرشد میں اتنے چور تھے کہ جاہ و ثروت کی طلب کر ہی نہ سکتے تھے نہ انہیں شہرت و تفوق کی پرواہ تھی۔ وہ زندگی بھر خادمِ خاص رہے اور مرنے کے بعد بھی قدموں ہی میں آرام کی جگہ حاصل کی۔

حُبِ جاہ و مال کا یہ حال تھا کہ ایک شخص بڑی بڑی اُمیدیں لے کر حضرت محبوب الٰہی کے پاس آیا۔ یہاں اس وقت اللہ کا نام تھا۔ حضرت نے سائل کو خالی ہاتھ واپس کرنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا کہ اپنی جوتیاں اٹھا کر اس کو دیدیں۔

واپسی میں ایک سرائے میں اس نے قیام کیا۔ وہاں امیر خسرو بھی مع اپنے خدم و حشم مقیم تھے۔ اس سفر میں خوب نفع کمایا تھا اور لدے پھندے گھر واپس آ رہے تھے۔ یہ سن کر کہ نو وارد دہلی سے آیا ہے، مرشد کی خیریت پوچھی۔ اس نے اپنی محرومی کی داستان سنائی۔ بس تڑپ گئے کہنے لگے یہ جوتیاں میرے ہاتھ بیچ ڈال اور میرا کل مال اسباب لے لے۔ وہ بے چارہ متحیر رہ گیا اور یہ سب کچھ دے دلا کر جوتیاں سر پر رکھ کر دہلی واپس آ گئے۔

تاریخ نظامی میں ایک جگہ اس مسئلے پر تھوڑی بحث ہے کہ حضرت نے امیر خسرو کو اپنا جانشین کیوں نہیں بنایا۔ لیکن امیر خسرو کی مرنجاں مرنج طبیعت، آزادانہ روش،

قلندرانہ زندگی، مذاہب عالم سے واقفیت اور عوام سے گہرا میل جول انہیں پیر بننے ہی کب دیتا۔ وہ خادم تھے۔ خدا کے بھی، مرشد کے بھی، مخلوق کے بھی۔ مخدوم بنتے کیسے۔

ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار دورانِ سفر شام ہوگئی۔ امیر خسرو کو رات بسر کرنے کی فکر تے ایک گاؤں میں پہنچا دیا۔ گاؤں والوں نے جو دیکھا کہ ایک مرد وجیہہ جبہ وعمامہ زیب سر، نورانی صورت خچر پر سوار چلا آرہا ہے۔ تو دوڑ پڑے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ پیر جی بس تعویذ جلدی سے لکھ دو۔ چودھری کی بیوی مر رہی ہے۔ خدا کے لیے بچاؤ۔ اب یہ لاکھ کہتے جا رہے ہیں۔ میں پیر نہیں ہوں، مولوی نہیں ہوں۔ نہیں مانتے یہی کہتے رہے کہ تم سچے پیر ہو۔ بس مولوی جی ایک تعویذ تو چودھری کی عورت کو دے ہی دو۔ ناچار، ہجوم اور اصرار سے عاجز آکر انہوں نے قلم سنبھالا۔ ایک پرچے پر کچھ لکھا اور کہا کہ اس کو موم جامہ کرکے ابھی پہنا دو۔ کھول کر نہ دیکھنا۔ تعویذ تو عورت کے پاس گیا اور یہاں اُن کی رات بھر خوب خاطر مدارات ہوئی۔ چودھری بھی خوش خوش تعویذ کی تعریف کرتا ہوا آیا کہ فوراً اثر ہوا۔ عورت اچھی ہے اور بیٹا پیدا ہوا ہے۔

صبح ہوتے ہی امیر خسرو نے اپنی راہ لی اور گاؤں میں تعویذ لوگوں کا سہارا بن گیا۔ جس عورت کو ضرورت ہوتی، چودھری کے گھر سے تعویذ مانگ لیا جاتا۔ ایک ملّا بھی اس گاؤں میں رہتا تھا۔ اس تعویذ سے پہلے اس کی خاصی کمائی ہو جاتی تھی۔ پیسہ ملتا، چیزیں ملتیں اور مرغ الگ کھانے کو ملتے۔ وہ سب بند ہو گئے۔ ایک روز ملّا نے اپنی بیوی سے کہا تو کسی بہانے چودھری کی بیوی سے تعویذ مانگ لا۔ میں دیکھوں تو اس میں کیا لکھا ہے۔ پھر وہی میں بھی لکھا کروں۔ بیوی نے جا کر پڑوسن کی بیماری کے بہانے تعویذ حاصل کیا اور شوہر کو لا کر دیا۔ بسم اللہ کہہ کر ملّا نے جو تعویذ کھولا تو صرف ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

مرا جا شد، خرم را نیز جا شد   زنِ دہقاں بزاید یا نزاید

یعنی مجھ کو جگہ مل گئی۔ میرے "خچر" کو مل گئی۔ گنوار کی عورت کے بچہ ہو یا نہ ہو۔

یہ تھے امیر خسرو۔ انسانیت و انسان دوستی، آن کا شعار تھا۔ حکمراں قوم نہ مقامی علوم وفنون سے واقف تھی، نہ زبان و مذہب سے۔ یہ امیر خسرو ہی تھے۔ جنھوں نے مذاہب کی ریسرچ بھی کی اور لوگوں کے لیے راگ راگنیاں بھی ایجاد کیں اور سالکانِ راہ حقیقت کے لیے نئی پگ ڈنڈیاں بھی ہموار کیں۔ ہندوستانی تصوف اور اسلامی تصوّف میں کیا فرق ہے۔ نئے فلسفۂ خیال کی بنیاد کب سے پڑی اور تصوّف پر ہندی یوگ کا کیا اثر ہوا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ذرا تفصیلی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

لیکن امیر خسرو نے فارسی شاعری کو ہندی تخیل سے اور تصوف کو ویدانت سے کس طرح روشناس کیا، یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے۔ اتنا وقت نہیں کہ میں کوئی تفصیلی تذکرہ کر سکوں۔ بس یوں سمجھیے کہ امیر خسرو نے اسلامی سادگی کو ویدانی فلسفے شعر و نغمہ کے ذریعے ہم آہنگ کیا اور ہندی تہواروں کی رنگ رلیوں کو تصوف کے ذریعے الوہیت کا جامہ پہنایا۔ وہ فارسی اور برج بھاشا کو ملا کر ایک ایسا معجون تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جو اس وقت کے قومی مزاج کے لیے موافق اور معتدل ثابت ہو سکے اور جس سے دو بیری قومیں ایک دوسرے کے نزدیک آسکیں، بلکہ گلے لگ سکیں۔ جس طرح مرشد کی محفل میں ذات پات، قوم و مذہب کی کوئی قید نہ تھی، خسرو نے بھی علم و ادب کی ایسی محفل سجائی، جس میں حق شناسی کا نور، خود شناسی کی روشنی، ہندی کا رس، فارسی کی شیرینی، قرآن کی حکمت و لطافت اور اُپنشدوں کا فلسفہ و گہرائی سموئی ہوئی تھی اور یہ سب یوں کہ؛

در کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق   ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

امیر خسرو ہمارا تہذیبی سرمایہ اور ہمارے ذہنی ارتقا کی تاریخ ہیں۔ کاش ہم انہیں ہر وقت یاد رکھ سکتے۔

غالب ـــــ ایک فیچر

(حسبِ معمول انجمن ترقی اردو شاخ دلی کے اہتمام میں ۲۰ر فروری کو یوم غالب منایا گیا جس میں پیش نظر مضمون پڑھا گیا۔)

بیٹھے بیٹھے جی گھبریا اور امراؤ بیگم نے جنّت کی کھڑکی ذرا سی کھول کر جھانکا تو کیا دیکھتی ہیں مرزا غالب باچشم حیران ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ بیگم نے پکارا۔ اے ہے مرزا کیا تضیع اوقات کر رہے ہو۔ اب تو بہت دن ہو چکے، کتنی بار میں نے کہا۔ رضوان صاحب بھی بارہا فرما چکے ہیں۔ یہاں آجاؤ نا۔ جنت میں آکر اطمینان سے رہو آرام سے گزرے گی۔ اللہ رکھے ہمہ نعمت موجود ہے۔

مرزا صاحب نے چونک کر بھرپور نظر ڈالی مسکرائے اور بولے۔ بیگم "گوشہ میں چمن کے مجھے آرام بہت ہے"۔ وہاں ایک کونہ میں دبک کر بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ۔ اعراف میں نظارہ جنت بھی کرسکتا ہوں اور دوزخ کی ہماہمی بھی پیش نظر ہے۔ ایک طرف گرم لپٹیں آرہی ہیں تو دوسری سمت سے سرد و خنک ہوائیں۔

سامنے اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور یہ

"ہنگامہ پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل"

اب تو بس اسی دن وہاں آؤں گا جب "اصل شہود و شاہد مشہود" کھل کر سامنے آجائیگی "مشاہدہ" میں پہلے ہی کہہ چکا کسی حساب میں نہیں۔

بیگم۔ توبہ۔ تم اب تک اسی شعر و شاعری کے چکر میں پھنسے ہو۔ اتنے برس ہو گئے اور تصور و تخیل سے پیچھا نہ چھوٹا۔

مرزا۔ اس کا الزام مجھ پر کیوں رکھتی ہو بیگم۔

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

اور سچ پوچھو تو۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

بیگم۔ عقل کے ناخن لو مرزا صاحب اصنامِ خیالی اور اوہام تو سب پیچھے چھٹ گئے۔ یہاں تو حقیقت ہی حقیقت ہے، بے نقاب سچائی۔

مرزا۔ اچھا بھئی اگر ہم وہاں آبھی جائیں تو پھر کیا ہوگا۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

بیگم۔ اور کچھ نہ سہی۔ مگر جنّتی تو کہلاؤ گے۔ پرہیزگاروں میں اٹھنا بیٹھنا رہے گا اور ایک بات یہ بھی ہے (کچھ شرما کر)

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

مرزا۔ حیران ہو کر۔ ایں۔ یہ کیا۔ ماشاء اللہ۔ یہ میرا شعر تم کو کیسے یاد ہو گیا۔ تم تو ہمیشہ میرے دیوان کو کہا کرتی تھیں۔ ٹکی پڑے جھاڑ دو بھرے۔

بیگم۔ اے ایک دن بیٹھے بیٹھے سوچا کہ زندگی میں تو آپ شعر پڑھتے اور میں کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ اب ملتا تو دیکھتی کیا لکھا ہے۔ بس خیال آنے کی دیر تھی۔ کہ دیوان موجود۔ یہاں تو جو چاہو پل میں مل سکتا ہے۔ خیر صاحب خدا تمہارا بھلا کرے۔ دیوان تو میں نے اول سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ مگر اس کے آخری صفحہ پر اور بہت سی کتابیں لکھی تھیں۔ کچھ تمہاری تھیں اور کچھ دوسرے دنیا والوں نے تم پر لکھیں تھیں۔ پھر تو سب ہی مجھے مل گئیں۔

سچ کہتی ہوں۔ مرزا۔ دیوان اور خط پڑھ کر تو مجھے خوب ہی ہنسی آئی۔ کیا کیا دون کی تم نے لی ہیں خدا کی پناہ۔ مگر ایک بات سے تعجب بھی ہوا کہ کچھ کم سو برس تمھیں یہاں آئے ہو چکے ہیں اور دنیا والے نہ جانے کیسے ہیں کہ تمہارے متعلق لکھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

مرزا۔ بیگم، وہ محقق ہیں، ناقد ہیں۔ میرے کلام اور میری تحریروں پر اپنی عقل و سمجھ کے مطابق تبصرہ کرتے رہتے ہیں۔

بیگم۔ اے ہے اُن کے پاس اور کوئی کام نہیں ہے جو بس گڑے مردے اکھاڑتے رہتے ہیں اور مری لاش کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں تو محقق وہ کہے جاتے تھے، جو کوئی نئی چیز، نیا ملک، نئی دریافت دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے۔

مرزا۔ او ہو، اب تو تم بھی بہت قابل ہو گئیں۔ یہ جو لفظ ابھی تم نے بولا ہے۔ میرا شاگرد جان جاکوب اس طرح کے الفاظ بولا کرتا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی مجھ سے ملنے آجاتا ہے۔

بیگم۔ ارے وہ موا فرنگی اب بھی تم سے ملتا ہے۔ میاں اللہ اللہ کرو، کن دھندوں میں پڑے ہو۔ اب تو یہ دنیا داری کی باتیں چھوڑو۔ وہاں تو کوئی ہرگوپال تفتہ تھے۔ کوئی امراؤ سنگھ کوئی جانی جاکوب۔ سب ہی تمہاری آنکھوں کا تارا تھے۔

میں نے تمہارے خطوط بھی پڑھے ہیں۔ وہ ایک خط منشی شیو نرائن کو لکھا تھا نا؟ کہ "میں کیا جانتا تھا تم کون ہو۔ اب جانا کہ تم بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔" دوسرے کے بچے سے یہ پیار اور عارف مرحوم کے بچوں کی خط میں یہ شکایت کرتے ہو کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ دوپہر کو سونے نہیں دیتے ننگے پاؤں پلنگ پر چڑھ آتے ہیں۔ پانی لنڈھاتے ہیں، خاک اڑاتے ہیں۔

مرزا۔ دریں چہ شک۔ مجھے وہ اپنے بیٹے کی طرح پیارا تھا وہ سب میرے بچے، میرے شاگرد۔ میرے نور نظر تھے۔ جب دنیا میں رنگ و نسل، ذات، مذہب کے اختلافات کو میں نے اہمیت نہ دی اس عالم میں اس کا کیا ذکر۔ اب تو وہ اوپری خول بھی اتر چکے ہیں اور روح کا نہ کوئی رنگ ہے نہ روپ۔ اسی لیے میں نے کہا تھا۔

"ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے: ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں"

بیگم۔ تم ان باتوں کو کبھی نہیں سمجھ سکیں۔ "تمہیں اس پر اعتراض ہے۔ کہ میں نے اسے عزیزوں میں کیوں گنا۔

بندہ پرور میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے۔۔۔

باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں۔ اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے۔

میں چاہتا تھا کہ یا تو میں اتنا وسیع ہو جاؤں کہ ساری دنیا میرے اندر سما جائے یا پھر میں اتنا لطیف و ہلکا پھلکا بن جاؤں کہ کائنات کی روح میں جاری و ساری ہو سکوں۔ یہ وہ منزل انسانیت تھی جس کے ادراک و فہم سے تم محروم رہیں۔ افسوس۔

بیگم۔ چلو بس فلسفہ نہ بگھارو۔ یہ کھیلنا سکڑنا تم کو مبارک رہے۔ اسی کی

بدولت منھ کھولے اعراف میں بیٹھے ہو۔ نہ ادھر کے نہ ادھر کے ...

مرزا۔ یہ میری اپنی مرضی ہے۔ کسی نے مجبور تھوڑی کیا ہے اس عالم میں اگر درد و کرب میں لپٹی ہوئی آوازیں نالہ ہائے جاگر سوز، نفرت، بدی اور تعصب کے شرارے مجھے تڑپنے پر مجبور کرتے ہیں تو دوسری سمت سے لطیف خوشبو کی مہک خنک ہواؤں کے جھونکے رضائے الٰہی کی تجلیاں، سرور اور نشاط کے قہقہے جنت نگاہ فردوس گوش کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اس ماحول میں میرا انسان زندہ ہے۔ میں زندہ ہوں، تمہیں معلوم ہے مجھے فرشتہ سے زیادہ انسان پسند تھے۔

"گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں"

بیگم۔ (جھلا کر) پھر وہی سر پھری باتیں، آخر تمہیں کب عقل آئے گی۔ ساری زندگی خود تکلیف اٹھائی اور مجھے مصیبت بھوگتے گزری۔ وہ یاد ہے۔

سات پارچہ کا خلعت اور تین رقوم جواہر جو اس فرنگی نے دیے تھے۔ کھڑے کھڑے تم نے بازار میں بکوا کر چپراسیوں کو انعام بانٹ دیا تھا، قسم لے لو جو میں نے پھوٹی آنکھ سے بھی دیکھا ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہیں کے مہاراجہ انعام تقسیم کر رہے ہیں۔ دیوان پنے کا یہی حال تمہارا ہمیشہ رہا۔ اچھی بھلی جامہ دار کی فرغل نہ جانے کس خدائی خوار کی چھینٹ کی فرغل سے بدل لی تھی۔ اور مجھ سے کہا تھا۔ بیوی اس بچارے نے کبھی چھینٹ پہنی نہ تھی۔ غربت نے ان حالوں کو پہنچا دیا۔ اس لیے مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ یوں دیتا تو ان کو شرمندگی ہوتی۔ اس لیے بدل لی۔

کیا کچھ تم نے نہیں کیا۔ سارے کپڑے لتے تک توڑ پھوڑ کر کھا گئے اور کس فخر سے اپنے دوست کو لکھتے ہیں "لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑا کھاتا ہوں" کسی بات میں تو شرم نہ آئی۔

مرزا۔ اس میں شرم کیسی۔ جو خدا دیتا تھا وہ کھاتا تھا۔ لیکن گزری باتوں کا

ذکر کر کے کیوں اپنا اور میرا دل دکھاتی ہو

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

بیگم۔ میں بچاری کیا غم گساری کروں گی۔ اس وقت تو سارے ہندوستان والے تمہارے غم گسار ہو رہے ہیں۔

مرزا۔ دیکھو لو اب تو قائل ہو گئیں۔ کتنی قدر و منزلت میری ہو رہی ہے۔ ان لوگوں نے میرا مزار بنوایا۔ میرے دیوان کی شرحیں لکھیں۔ میری کتابوں پر تبصرے کیے۔ میرے نام سے محفلیں منعقد کیں اور کس شان سے میری کوششوں کو سراہا۔ میری تخلیقات کی نشر و اشاعت کی ہے۔ کہو تمہیں اب بھی میرا کلام پسند آیا۔

بیگم۔ پسند و سند کی بات نہ کرو۔ اے ہاں یہ بتاؤ وہ جان ہار محبوبہ کون تھی جس کے مرنے پر تم نے ایسا دردناک مرثیہ لکھا تھا۔

مرزا۔ یہ کیوں بتاؤں۔ یہ کہو کیسا ہے۔

بیگم۔ سچ کہتی ہوں میرے تو آنسو نکل آئے۔ کیا دردناک نوحہ تم نے کہا ہے اور بے اختیار جی چاہا کہ کاش تمہارے ہاتھوں میں بھی اللہ کو پیاری ہو جاتی تو ادل منزل لے جاتے ہوئے ایسا ہی مرثیہ کہتے۔

مرزا۔ کچھ سوچ کر نہیں بیوی تمہارے لیے شاید میں ایسا نہ کہہ سکتا۔ جب دل پر چوٹ لگتی ہے، درد و تاثر کی لہریں ابھرتی ہیں۔ تو اس وقت آمد ہی آمد ہوتی ہے۔ الفاظ خود بخود موزوں ہو کر شعر کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔

بیگم۔ بگڑ کر۔ ہاں ہاں میرے لیے کیوں کہتے، میں نے تمہارا وہ خط بھی پڑھا ہے جس میں تم نے امراؤ سنگھ کی بیوی کے مرنے پر لکھا ہے کہ

میاں مجھے تمہارے اوپر رحم آتا ہے اور اپنے اوپر رشک۔ اللہ ایک

تم ہو کہ دو بار ہڈیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ دداو پر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندہ گلے میں پڑا ہے۔ نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ بھائی تیرے بال بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنسا ہے"

میں ناحق تمھیں بلانے آگئی تھی، زندگی میں دور دور بھاگتے رہے اور اب بھی کنارہ کش ہوئے بیٹھے ہو۔ میں نے سوچا خود تو آرام و راحت کے مزے لوٹ رہی ہوں۔ تم بھی آجاتے تو اچھا تھا، ذرا دو گھڑی بات کرتے دل بہلتا۔ زندگی میں تو کہتی تھی۔ بڈھے ہو، سٹھیا گئے ہو۔ اب یہاں تو نہ جوانی ہے، نہ بڑھاپا۔ کیا کہوں۔

مرزا۔ کچھ نہ کہو بیگم۔ شاعر جو دیکھتا ہے اس سے متاثر ہوتا ہے۔ واقعات سے نتائج اخذ کرتا ہے اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

بیگم۔ یہ جتنی باتیں تم نے لکھی ہیں سب سچی ہی ہیں۔

مرزا۔ بے شک۔ بھلا میرے گھر کی چھت نہ ٹپکتی تو میں یہ کیوں لکھتا کہ: "آسمان ایک گھڑی برسے تو چھت دو گھنٹہ برستی ہے۔"

بیگم۔ لکھنے کا تو تمہیں مرض تھا۔ خطوں میں تم نے دنیا جہاں کی باتیں لکھ ڈالی ہیں۔ چودھری عبدالغفور کو لکھا ہے۔

غلہ گراں ہے اور موت ارزاں۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔

بھلا خط میں اناج کا بھاؤ لکھنے کی کیا ضرورت تھی لکھتے ہو۔ کہ:

ماش کی دال آٹھ سیر کی، باجرہ سولہ سیر کا۔ گیہوں بارہ سیر کا، چنے ۱۶ سیر کے اور گھی روپیہ کا ڈیڑھ سیر۔

مرزا۔ مسکرا کر۔ یہ بھی تو میں نے لکھا ہے کہ "سوائے اناج اور اوپلوں کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ ہو" جانتی ہو یہ سب کیوں لکھا تھا۔ تاکہ آنے والی

نسلیں یہ نرخ دیکھیں اور شرمندہ ہوں یہ مجھے کیا معلوم تھا کہ سو برس بعد میرے ملک والے بنفشہ کی پڑیوں میں اناج بیچیں گے۔

بیگم۔ اچھا تو پھر اب کیا ارادہ ہے آتے ہو یا میں کھڑکی بند کر دوں۔

مرزا۔ اب اس کھڑکی سے کود کر تو میں آنے سے رہا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

بیگم (جھلا کر) اونہہ اچھا تو بیٹھے رہو تصورِ جاناں کیے ہوئے۔

حکیم مومن خاں مومنؔ

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

یعنی اگر تم بیتے ہوئے دن اور مٹتی ہوئی صورتوں کو یاد رکھنا چاہتے ہو تو کبھی کبھی گڑے مردے بھی اکھیڑ لیا کرو اور شاید اسی لیے تذکرہ نویسوں نے یہ دستور بنا لیا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کا ذکر اس کے آباؤ اجداد سے شروع کرتے ہیں۔

ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک ضرورت سے زیادہ عقلمند آدمی نے کہا تھا کہ اگر تم درختوں کی جڑوں کو پہچان لو تو اُن کے پھل پھول کو خود بخود پہچان لوگے حالانکہ آپ سب کو معلوم ہے کہ درختوں کی جڑیں زمین کے اوپر نہیں دھری ہوتیں اور نہ اس کے پھل پھول پاتال میں ہوا کرتے ہیں مگر بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں) میں اسے سمجھنے کی ہرگز نہ کوشش کرتی اگر "یوم مومن" پر مجھ سے مقالہ پڑھنے کو نہ کہا جاتا۔

کہتے ہیں حکیم مومن خاں بھی پہلے جڑ ہی پہچانا کرتے تھے۔ بڑے زبردست

نباض تھے۔ دو انگلیاں نبض پر رکھتے ہی مریضہ کی "لالہ رخی سہی قدی، گل بدنی، سمن بری" کا اندازہ لگا لیتے تھے۔ اپنے زمانہ میں حکیم نابینا صاحب کا قصہ بھی سن رکھا ہے کہ بھینس کے پیر میں بندھے ہوئے ڈورے کو پکڑ کر انھوں نے کھلی بنولہ والا نسخہ لکھ دیا تھا۔ اور ڈورے کی جنبش سے سمجھ گئے تھے کہ مریضہ نازک اندام حسینہ نہیں پوری بھینس کی بھینس ہے۔

خوش قسمتی سے اس وقت اہل علم کا مجمع ہے۔ ایسے ثقہ اور متین حضرات ضرور ہی مومن کے حسب نسب سے لے کر سات پشت تک کی خبر لیں گے اور باپ دادا سے شروع کر کے حقہ اور آفتابہ تک کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش فرمائیں گے۔

میں نہ حکیم ہوں نہ ماہر نباتات، نہ تذکرہ نویس اس لیے مجھے تو اس "کوہ کندن و کاہ بر آوردن" سے معذور ہی سمجھیے۔

میرا تو جی چاہتا ہے مومن کی زلف گرہ گیر کی تعریف کروں۔ ان کی قاتل آنکھوں پر قصیدہ پڑھوں۔ ہلال ابرو کے بانکپن کا ذکر کروں۔ ان کی چیتے جیسی کمر اور شمع جیسی حنائی انگلیوں کی مدح سرائی کروں اور یوں اگلے پچھلے سب شاعروں کا جی جلاؤں۔ آخر میرا جی کچھ کم جلا ہے۔ شاعروں کی نغمہ سرائیاں سنتی ہوں تو ایسا لگتا ہے۔

فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

اور جو کہیں اتفاقیہ ملاقات ہو جاتی ہے تو بس کچھ نہ پوچھیے اور کچھ منہ سے نہ کہلوائیے۔

میں انھیں دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے۔

خود مومن کو اپنے حسن پر اتنا ناز تھا کہ اس تخلیق پر صانع قدرت کی تعریف اور شکر ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

والشکر لصانع البرایا
جس نے ہمیں آدمی بنایا

اور آدمی بھی کیسا عاشق تن، معشوق صورت، نبض شناس، اختر شناس۔ مومن کی اٹھتی جوانی نے کیا کیا تیر مارے ہوں گے۔ اس کی تفصیل سے تاریخ کے لب بند ہیں لیکن یہ سب کہتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے بہت خوبصورت خوش پوشاک و خوش ذوق انسان تھے تصویر دیکھ کر تو ٹھیک اندازہ نہیں ہوتا شاید اس کی وجہ ڈیڑھ صدی کا درمیانی بُعد ہو۔ ویسے زمانہ کا مذاق بھی سدا بدلتا رہتا ہے آج کل انہیں دیکھ کر مرید ہو جانے والے بہتیرے مل جائیں گے مگر عاشق ہونے پر کوئی مشکل ہی سے تیار ہوگا۔ شاید ہی کوئی جان جہاں اس پر راضی ہوگی۔ بقول میر حسن ؎

گیسو دراز سن کے ترے دل ہوا ہے بند
توسلسلہ میں اپنے ہمیں بھی مرید کر

سوال یہ ہے کہ کیا مومن کو بھی کسی محفل میں متعارف کرانے سے پہلے تمہید کی ضرورت ہے؟ میرا تو خیال ہے سارے ہندوستان میں شاید ہی کوئی اردو داں ایسا ملے گا جو مومن کو نہ جانتا ہو۔ اور اب تو دیوان غالب کا ہندی ایڈیشن چھپنے کے بعد ہندی والے بھی ان کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ اردو بولنے والوں میں تو ان کے اشعار اور مصرعے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جہاں تنہائی ہوئی اور وحشت سوار ہوئی اور کسی کی یاد ستانے لگی، مومن کا شعر زبان پر آ ہی جاتا ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سنتی ہوں اس شعر پر غالب نے سر پیٹ کر کہا تھا "کاش مومن خاں میرا

سارا دیوان لے لیتا اور یہ شعر مجھے دے دیتا" فطرت کی ستم ظریفی کبھی سپاہی زادوں کو شاعر بنا دیا کرتی ہے اور کبھی شاعروں کے دل میں غازی بننے کا ارمان پیدا کر دیتی ہے۔ مومن بھی ایسے ہی بے تکے ارمان کا شکار تھے۔ جی تو چاہتا تھا کہ کارِ زریں سنواریں۔ بادشاہت کی ڈوبتی ناؤ کو بچائیں۔ جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کریں اور علمائے دین کے لانبے دامنوں کے سائے میں شطرنج کی بساط بھی جما دیں۔

لیکن تقدیر نے حسن و عشق کے جھمیلے میں پھنسا دیا۔ ہاتھ میں قلم اور شطرنج کے مہرے تھما دیئے اور آنکھوں کو اختر شماری کا چسکا پڑ گیا۔ خود کہتے ہیں۔

ان نصیبوں پہ کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد

نتیجہ یہ ہوا کہ خالی خولی گفتار کے غازی بنے رہے اور آسمان تکا کیے۔ پانسہ پھینکتے رہے۔ البتہ تخیل کی اڑان آسمان میں تھیگلی لگاتی رہی۔ کہتے ہیں۔

"جب اچھلا میں زمین سے دامن گردوں کو چھو آیا"

مومن نے دوسرے شعراء کی طرح بال کی کھال نہیں نکالی ہے۔ نہ زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ سیدھے سبھاؤ جوان آدمیوں کی طرح عشق بازی کی ہے۔ ان کا معشوق معمہ نہیں ہے۔ وہ حضرت آدم کے بیٹے تھے اور حوا کی بیٹیوں سے انہوں نے عشق کیا ہے۔ ان کی تعریف کی ہے۔ ان کی یاد میں سرد آہیں بھری ہیں۔ محبوبہ کے فراق میں تن بدن میں آگ سلگتی محسوس کی ہے اور انتظار میں بے شمار راتیں بتائی ہیں۔ اس کی ہر مراد پر صدقے قربان ہوئے ہیں اور اس تمام کیفیت اور ساری کشمکش کو سادی اور ستھری زبان میں شعر و نغمہ کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔

مومن کے رقیب بھی نظیر کے رقیبوں کی طرح ہرٹو نگے اور غالب کے

رقیبان روسیاہ جیسے دیدہ دلیر نہیں ہیں۔ پھیکے سیٹھے اور مومن ہی کی طرح شریف زادہ ہیں اس لیے پھکڑپن اور تو تڑاق کی نوبت نہیں آنے پاتی۔ میٹھے میٹھے طعنے تشنے ہو جاتے ہیں۔ دھیمی دھیمی چوٹیں چلتی رہتی ہیں۔

خود معشوقہ بھی کھیلی کھائی ہر جائی نہیں ہے۔ الھڑ پردہ نشین، شریف زادی ہے۔ ویسے سادگی پُرکاری اور ہوشیاری میں جواب نہیں رکھتی۔ مگر لاکھ کھل کھیلے نظر نیچی ہی رہتی ہے۔ عارضوں کے گلاب مہک اٹھتے ہیں۔ مارے حیا کے رنگ لال پیلا ہونے لگتا ہے اور مومن خود ہی شرما جاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

جوں نقاب اٹھا مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشیں کا دیکھ کر

اتنی سیدھی اور شرمیلی ہونے کے باوجود ایک بار کی ملاقات کے بعد ہی دوسرے دن اس نے اقرار کر لیا کہ

دلِ مشتاق تپاں ہے یاں بھی
زینتِ لب پہ فغاں ہے یاں بھی

مومن حکیم تھے، منجم تھے، شاعر تھے، رمال تھے اور پھر شاعر بھی تھے لیکن شاعری ہی کے تانے بانے پر طبابت کی زر لفت بُنا کرتے تھے اور عشق کی ابتدا اسی نباضی سے ہوئی۔ فرماتے ہیں۔

میں نے اس نبض پہ جو ہاتھ دھرا
ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا

اچھا ہی ہوا ان دنوں صرف نبض ہی دیکھنے کا دستور تھا۔ جو پردہ نشینی کی لاج رہ گئی۔ کہیں اب کے ایسے بے دھڑک حکیم ڈاکٹر ہوتے تو پردہ کے باہر ہی سے اکسرے لے لیتے۔ طبابت ہی کی بدولت یہ حادثہ پیش آنا تھا۔

کیا لگا دستِ دل آرام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

بندہ بشر تھے۔ اس لیے جب کبھی غلوئے معدہ کی شکایت ہو جاتی تو ہیئت و نجوم کا چورن بنا کر حسن و عشق کی چاشنی سے معجون تیار کر لیا کرتے تھے۔ ویسے ان کے پاس نہ کبھی الفاظ کا توڑا ہوا نہ خیالات و جذبات کا مگر کسی بڑے پھیر میں پڑنے کی مومن نے کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کی شاعری میں نہ قفس کی تیلیوں کا ذکر ہے نہ چڑیا چڑا بننے کی آرزو ہے نہ آشیانہ کے لیے تنکے بٹورنے کی امنگ ہے، ان کے یہاں بجلیاں بھی ذرا کم ہی گرتی ہیں۔ بس شمع دھیمے دھیمے جلتی رہتی ہے۔ دھواں چھوڑتے ہوئے چراغ آخری لو دے کر بجھ جایا کرتے ہیں۔ نقاہت، عیادت اور میت کا سیاپا بھی ہلکا پھلکا ہے۔ رقیبوں سے کتنا ہی رشک و حسد کیوں نہ ہو مگر نوک جھونک کے وقت تمیز و تہذیب کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ حتّٰی کہ حضرت واعظ اور ناصح سے بھی شرافت کے ساتھ ہی دو چونچیں ہوتی ہیں۔ بڑے ہی بھلے مانس تھے بیچارے۔

بس ذرا پردہ نشینوں سے دلچسپی زیادہ تھی کیونکہ متشرع آدمی تھے اس لیے کھلے بندوں بے محابا بجلیاں گرانا اور غیر مردوں سے دیدے لڑانا انھیں اچھا لگتا تھا۔

لکھنؤ کے ایک شاعر آلِ رضا نے ایک بار کہا تھا۔

پردہ اٹھ جانے پہ مٹ جائے گی اے حسرتِ دید
وہ جو اک بات ہے بجلی سی چمک جانے میں

مومن بھی اسی کے قائل تھے کہتے ہیں۔

ہجرِ پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

دوسرے شعراء کی طرح ایذا طلبی اور ایذا پسندی ان کے ہاں بھی ہے

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی
پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

اپنی زندگی ہی میں انہوں نے شب ہجراں کو چیتاونی دیدی تھی۔

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

لیکن اس نامراد نے آخر دم تک ساتھ نہ چھوڑا۔

مومن جس طرح خود نک سک سے درست تھے ان کے اشعار بھی خوب نوک پلک سے آراستہ ہیں۔ جتنے جامہ زیب و باسلیقہ تھے اظہار جذبات میں بھی وہی رچاؤ رس اور ستھرائی برتتے ہیں بالکل سگھڑ گھروالی کا ایسا سلیقہ اور صفائی۔
شاید کسی دن معشوقہ نے کہا ہو گا کہ بھئی کیا کریں، کیسے تمہارے گھر آئیں۔ دوسروں کو شکایت ہو جاتی ہے۔ اعزہ الگ نکو بناتے ہیں۔ اور مومن نے غالباً اس کے جواب میں آہ سرد بھر کر کہا تھا۔

کیسے گِلے رقیب کے کیا طعن اقربا
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

کافی دلیر آدمی تھے مگر محبوبہ کی نظر عنایت دیکھتے ہی ڈر جاتے اور کہتے ؎

بخت بد سے یہ ڈر آیا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں
تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

مومن نام ہی کے مومن نہ تھے بڑے دین دار پرہیز گار تھے اور اللہ سے دعائیں بھی مانگا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک رات وہ مشہور دعا مانگی تھی جس کا نتیجہ مرگ ناگہانی کی صورت میں ظہور پذیر ہوا تھا۔

دعا بلا تھی شب غم سکونِ جاں کے لیے
سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے

خدا سے یہ بھی دعا کرتے تھے۔

وہ رفعت حال دے کہ جس نے
منصور کو دار پر چڑھایا
اس کا مرے دل پہ ایک پرتو
جس شعلہ نے طور کو جلایا

مرنجان مرنج بھی تھے اور انتہائی خوددار بھی۔ نہ کسی کی ہجو کرتے تھے نہ مدح و ستائش۔ لیکن زمانہ ایسا تھا کہ یا سوداؔ کی طرح لٹھ لے کر پیچھے دوڑ پڑو یا تعریف میں قصیدہ پر قصیدہ پڑھو۔ ناچار بس اتنا کہہ کر ایک بار حسن طلب اور تعریف کا حق ادا کر دیا تھا۔

تیرے حسّاد رنج گونا گوں
تیرے احباب اور تن آسانی

مومن زمین ہی پر خیالی گھوڑے دوڑاتے رہے اڑدوئے معلّٰے بولتے اور عالم تصور میں ماہ و انجم سے اٹکھیلیاں کرتے رہے۔ اپنی طبابت سے بھی انہوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ زخم جگر مرہم اور دواؤں کا ذکر کس شاعر کے یہاں نہیں ہے مگر مومن خالص حکیمانہ انداز میں جرّاح سے پوچھتے ہیں۔

جرّاح کیا سوچا بتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا
کیوں کھول دی پٹی مرے زخم جگر سے باندھ کر

بڑھاپے سے شاید ان کو سخت نفرت تھی۔ کنپٹی پر پہلا موئے سفید دیکھ کر ان کو خدا یاد آ گیا اور دل لرز گیا۔ کہتے ہیں۔

موسفیدی کے قریب اور یہ غفلت مومن
نیند آتی ہے بہ آرام دگر آخر شب

اور اسی وجہ سے مومن نے بالکل ٹھیک اور صحیح وقت پر ملک الموت سے مصافحہ کیا اور ان کی شاعری جوان رہ گئی۔ بڑھاپے کے آثار میں جب بال کی کھال نکالنے کو جی چاہنے لگتا ہے تب آمد کے دروازے تو بند ہو چکے ہوتے ہیں۔ آورد کے لیے کھڑکیوں اور روشن دانوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایسے میں ایک حساس دل پر جو بیتتی ہے اس کا اندازہ غالب کے خطوط پڑھ کر ہوتا ہے۔

ایک شعر البتہ معلوم ہوتا ہے انھوں نے بڑھاپے ہی کے لیے کہا تھا مگر وہ خود تو محفوظ رہے شعر دوسروں پر چسپاں ہو گیا شعر یہ ہے۔

مومن تم اور عشق بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے
یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

لیکن ذرا ٹھیریے میرا یہ سب کہنے کا تو ارادہ ہی نہ تھا۔ تذکرہ تھا ان کے حسن صورت اور "مذاق کہنہ" کی بوالعجبی کا۔

کیا مولانا آزاد کبھی بچّہ تھے!

(جامعہ ملیہ آزاد ڈے ۱۰ مارچ ۶۶ء)

سامنے بچے کھیل رہے ہیں، ایک دیوار پر چڑھ کر کسی کو پکار رہا ہے دوسرے نے فٹ بال پھینکا اور کئی ایک ساتھ دوڑ پڑے۔ دو آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ غل غپاڑہ مچا ہوا ہے، چیخ رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں۔ ان سب کے درمیان ایک قدر مشترک ہے۔ کھیلنا، خوش ہونا، بھرپور مسرت حاصل کرنا۔

لیکن کیا کبھی مولانا آزاد بھی بچہ رہے ہوں گے۔؟ وہ کھیلتے بھی ہوں گے۔ ان کی غضب کی سنجیدگی، بلا کا رعب اور بزرگانہ انداز دیکھ کر ہی تو میں نے بہن فاطمہ بیگم[1] مرحومہ سے پوچھا تھا کہ بھلا مولانا بھی بچپن میں کبھی کھیلتے کودتے اور شرارت کرتے تھے یا اس وقت بھی اسی طرح مقطع بنے بیٹھے رہتے تھے۔ میرے سوال پر وہ خوب ہنسیں اور کہنے لگیں، تمہارے مولانا بچپن میں بھی غیر معمولی تھے۔ ان کا کھیل سنو گی۔ ہم سب بچے ساتھ کھیل رہے تھے۔ کھیل کی نئی نئی راہیں ایجاد ہو رہی تھیں، مولانا کہنے لگے۔ دیکھو تم لوگ میرے داہنے بائیں کہنیاں مارتے ہوئے اس طرح آگے بڑھو جیسے بھیڑ کو ہٹا کر راستہ صاف کر رہے ہو۔ میں درمیان میں چلتا رہوں گا اور یوں کہو، ہٹو ہٹو۔ حضرت مولانا تشریف لا رہے ہیں اور پھر کسی تخت، بکس یا اونچی میز پر چڑھ کر کھڑے ہو جاتے

---

[1] مولانا آزاد مرحوم کی دو سال بڑی بہن تھیں۔

اور تقریر شروع کر دیتے۔ یہ تھے ۹ سال کے ننھے ابو الکلام اور ان کا کھیل۔

سچ کہتی ہوں مجھے بڑا ترس آیا۔ بیچارے مولانا ۵۰ سال پہلے کا مقدس گھرانا جہاں انہوں نے جنم لیا تھا، نظروں کے سامنے آگیا۔ وہ بیچارے اور کیا کھیلتے۔ قدم قدم پر تو اس گھر میں اللہ اور رسول کی مہر تھی۔ پیروں اور مشائخ کا خاندان تھا۔ ہر سمت سے قال اللہ اور قال الرسول ؐ کی آوازیں آتی ہوں گی۔ مریدوں اور عقیدت مندوں کے جمگھٹے تھے۔ بچہ ذرا پیر بھی اُٹھاتا ہوگا تو مرید اللہ آمین کر کے دوڑ پڑتے ہوں گے۔ اللہ۔ ان کی چونچال طبیعت کیا کچھ نہ مجبور کرتی ہوگی مگر وہ کبھی گلی ڈنڈا نہ کھیل سکے۔ کبھی دیوار نہ چڑھ سکے۔ کبھی شور مچانے کی ہمت نہ پڑی۔ نہ کبھی کھُل کر قہقہہ لگایا ہوگا۔ گھر سے باہر نکلتے ہوں گے تو کوئی نہ کوئی اتالیق بزرگ سایہ کی طرح ساتھ ہدایتیں دیتے چلتے ہوں گے۔ اس طرح آداب کرو۔ یوں نظریں نیچی رکھو۔ کھانا اس طرح اور بات اس ڈھنگ سے کرو۔ مگر کسی نے یہ نہ پوچھا ہوگا، تمہارا کیا جی چاہتا ہے؟

نام بھی تو کیا بڑا اسا رکھا گیا۔ محی الدین احمد ابو الکلام آزاد۔ تاکہ ایک لمحہ کے لیے بھی بچپن کا احساس نہ پیدا ہونے پائے۔ فضیلت کی پگڑی بندھنے سے پہلے ہی ابو الکلام کا صافہ باندھ دیا گیا۔

آنکھ کھولی تو رشد و ہدایت کی مسند روحانیت پر اپنے والد ماجد کو متمکن دیکھا جن کی شہرت ہندوستان سے لے کر حجاز تک پھیلی ہوئی تھی۔ کھلونوں کے بدلے کتابیں تھمکیں تو پتہ چلا کہ قدرت نے ذہانت و ذکاوت کے ڈونگرے برسا دیے ہیں۔ بقول سعدی

بالای سرش ز ہوشمندی

می تافت ستارہ بلندی

دوسرے لڑکے جب تک ایک کتاب پڑھتے مولانا چار ختم کر کے رکھ دیتے۔ اسی غیر معمولی حافظہ اور ذہانت نے چودہ پندرہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل بنا کر سچ مچ بزرگوں کی صف میں لا بٹھایا۔

اس ماحول کا تو یہ اثر ہونا چاہیے تھا کہ مولانا سوکھی روٹی کی طرح کھردرے ہو جاتے مگر تعجب تو یہ ہے ایسا نہیں ہوا۔ آگے چل کر احمد نگر جیل میں ذرا سا موقع مل گیا تو لطافت ذوق اور رنگینیٔ طبع "غبار خاطر" بن کر ہندوستان پر چھا گئی اور طبع رسا نے مجبور کر دیا کہ

انچہ نتواں گفت اندر صومعہ باز اہداں

بے تحاشا بر سر بازار می گوید بگو

اسی نو عمری میں اخبار رسالے نکالے۔ کتابیں لکھیں اور پوری پوری لائبریریاں آنکھوں کے راستے دماغ میں اتار لیں۔ انجمن حمایت اسلام والے بھی اس بالغ نظری سے دھوکا کھا گئے اور دعوت نامہ بھیج دیا۔ اسٹیشن پر استقبال کرنے والے ایسے لڑکے کا استقبال کرنے تو آئے نہ تھے۔ جس کے ڈھنگ سے داڑھی مونچھ بھی ابھی نہ نکلی ہوگی۔ انہوں نے پوچھا، میاں صاحب زادے اسی گاڑی سے مولانا ابو الکلام آزاد تشریف لا رہے تھے اور یہ جواب سن کر کہ یہی مولانا ہیں سب پر اوس پڑ گئی۔ جلسہ شروع ہوا تو منتظمین کے دل دھڑک رہے تھے لیکن جب منہ سے پھول جھڑنے شروع ہوئے تو ساری محفل معطر ہو گئی اور سر عبد القادر جیسے پختہ مغز نے اٹھ کر سینے سے لگا لیا۔

سنتی ہوں، انہیں دنوں ان کی شادی بھی ہو گئی مگر ذوق علم اور کاوش فکر اس وقت تک اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ بچپن کی محرومیاں سنجیدگی کا روپ دھار چکی تھیں اور مولانا اپنے گرد و پیش سے آنکھیں میچ کر کتابوں کا کیڑا بن چکے تھے۔ کہتے ہیں بیوی حسن و جمال کا مرقع تھیں مگر علم و حقیقت کی متلاشی نظروں میں بنگال کا حسن ملیح بھی چکا چوند پیدا نہ کر سکا اور علم کا شیدائی حسن مجازی کا دیوانہ بن نہ سکا۔ دوری ہم آہنگی کا منہ چڑھاتی رہی۔

فاطمہ بیگم کہتی تھیں کہ ایک روز کمرے میں لیٹے پڑھ رہے تھے۔ بیوی ذرا دیر کو اٹھ کر کمرے سے چلی گئیں۔ پاس ہی تپائی پر زیورات کا صندوقچہ رکھا تھا۔ کوئی ستم ظریف آیا اور مولانا کے ہوتے ہوئے صندوقچہ لے کر چلتا بنا زلیخا بیگم لوٹیں تو یہاں میدان صاف تھا۔ دن دہاڑے کی چوری ہلچل مچ گئی۔ پوچھ تاچھ شروع ہوئی تو بیگم نے جھنجھلا کر مولانا سے پوچھا آپ تو یہاں موجود تھے۔ آخر کسی کو آتے جاتے دیکھا چونک کر کتاب سے نظریں ہٹائیں کیوں کیا ہوا؟ انھوں نے واقعہ بتایا تو لاپرواہی سے کہا ہاں کچھ آہٹ تو مجھے بھی معلوم ہوئی تھی۔ کوئی آیا تھا۔ سب سر پیٹ کر بیٹھ رہے۔

بہن کہتی تھیں کہ جب مولانا پیری مریدی، درس و تدریس سے دامن چھڑا کر اخبار رسالے اور کتابوں کی طرف متوجہ رہے تو انہیں کوئی پرواہ نہ ہوئی مگر سیاست کے جھمیلے میں پڑ کر جب جیل کی آمد و رفت شروع ہوئی اور برسوں کی جدائی کی نوبت آنے لگی۔ تب زلیخا بیگم بے قرار ہوگئیں حتیٰ کہ بعض اوقات روکنے کی کوشش بھی کرتیں لیکن بیسویں صدی کی زلیخا دامن تو پکڑ لیتی تھیں، دامن چاک نہ کر سکیں اور آخری جدائی پر تو جان ہی سے گزر گئیں۔ مولانا پر شاید غیر معمولی اثر ہوا جب ہی تو غبار خاطر میں آئینۂ دل کی کرچیں نظر آ رہی ہیں۔

میں نے انہیں دیکھا نزدیک سے بھی اور دور سے بھی۔ مگر اس وقت جب وہ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے اردگرد تار لپیٹ رہے تھے۔

وہ چہرے مہرے سے عربی النسل تھے اور مذاق طبیعت کے لحاظ سے ایرانی لباس خالص ہندوستانی پہنتے تھے۔ زبان علما کی بولتے تھے اور باتیں سیاست دانوں کی طرح کرتے تھے۔ لطافت طبع اور نزاکت مزاج کا یہ حال تھا کہ غلط لفظ، معیار سے گری ہوئی بات، بھونڈا انداز، یا شان کے منافی رویہ دیکھ کر جز بز ہو جاتے تھے۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی نے ان کو ہر بھونڈی، بے ہنگم، غلط اور بے ہودہ چیز کو برداشت کرنے پر مجبور کیا۔

مخالفوں کے طوفان، طنز و تعریض کی بارش، اور خون و آنسوؤں کی برسات میں بظاہر وہ چکنا گھڑا بنے رہے۔ کسی گروہ، کسی قوم، کسی فرد سے وہ تعلقات منقطع نہ کر سکے۔ لیکن پھر ان لوگوں کے منہ سے تعریف، خوشامد یا جھوٹی لن ترانیاں سننے کے لیے بھی انھوں نے اپنے کان بند کر لیے۔

ان کی فکر رسا جب منظر عام پر آتی تو اپنی صائب رائے فکر و نظر اور تدبر کے جوہر دکھا دیتی، سیاست کی گتھیاں انھوں نے سلجھائیں، ملک و قوم کے سپہ سالار وہ کہلائے سیاست کے ہر موڑ پر چٹان کی طرح ثابت قدم رہے خود اعتمادی اور صداقت پر یقین نے ان کے قدم کبھی متزلزل نہ ہونے دیے۔

۴۷ء کو کوئی مہینہ تھا۔ ہمایوں کے مقبرہ میں پناہ گزینوں کو پتہ چلا کہ کیمپ توڑ دیا گیا اور اب ان سب کو زبردستی شہر بھیج دیا جائے گا۔ اس خبر نے ہلچل مچا دی رونے والوں کا ہجوم ہمارے اردگرد جمع ہو گیا اور ہمیں اس حکم کو ملتوی کرانے کا یہی راستہ نظر آیا کہ مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر استدعا کریں کہ ایک ماہ کی میعاد اور بڑھا دی جائے۔ خیر جناب دل مضبوط کر کے پہنچے۔ ملاقات فوراً ہوئی۔ میں نے تو تھوڑا ہی کہا مگر بلقیس[1] نے مقرری کے سارے جوہر صرف کر دیے پیش منظر اور پس منظر مولانا سنتے رہے۔ جب دیکھا کہ اس کی زبان تو تالو سے لگتی ہی نہیں، برابر بولے چلی جا رہی ہے تو سیدھے ہو بیٹھے۔ ہتھیلی پر انگلی مار کر کہا یہ ہاں تو آپ چاہتی ہیں.... ایک..... دو..... تین۔ یہی تین مطالبات ہیں نا آپ کے۔ ہم دونوں چونک پڑے اور بلقیس نے تو حیرت سے منہ کھول دیا میں نے کہا ہاں بس یہی۔

کھڑے ہو گئے۔ اچھی بات ہے ہو جائے گا۔ لیجیے صاحب ملاقات ختم ہم دونوں بھاگے۔ اللہ بچائے۔ یہاں تفصیل بھی نہ ختم کرنے پائے تھے کہ وہاں خلاصہ ذہن میں

---

[1] میری چھوٹی بہن

آگیا۔ کام تو خیر شام ہی کو ہوگیا۔ جنگ آزادی کے دنوں میں گاندھی جی اور برٹش گورنمنٹ کی بات چیت جاری تھی مولانا کی نکتہ سنجیاں اور باریک بینیاں نہ جانے کتنے مواقع پر کانگریس کی عزت بچا لے گئیں۔

مولانا شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے علوم کا دریا تھے۔ مگر کبھی کبھی ایک چھوٹے سے حملہ پر بھی بہت محظوظ ہوتے تھے۔

عبدالوالی صاحب[1] بیان کرتے تھے کہ ایک بار کلکتہ میں چار مولوی صاحبان مولانا کے مہمان ہوئے۔ ان میں دو سچ مچ کے مولانا تھے۔ دو بنے ہوئے مگر چاروں کی لانبی داڑھیاں، نیچی تہبند انیاں اور ڈھیلے پاجامے کلکتہ جیسے شہر میں ذرا اجنبی سے لگتے تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ان چاروں کو اکٹھا گھومتے پھرتے دیکھا تو دوڑے ہوئے مولانا آزاد کے پاس آئے اور کہا "مولانا آپ کو معلوم ہے۔ یہ قبیلہ بنی لحیان[2] نے کیوں کلکتہ پر چڑھائی کر دی ہے۔ سنتے ہی پھڑک گئے، بنی لحیان کی پھبتی سے خوب خوب لطف اندوز ہوئے۔

پارلیمنٹری کانگریس پارٹی کی میٹنگ میں بھی اگر ذرا موقع مل جاتا تو ایک آدھ شعر پڑھ دیتے۔ تاریخ، ادب، سیاست، جغرافیہ کسی نہ کسی موضوع پر اپنے مختصر جملوں سے روشنی ڈالتے۔

لوک سبھا میں ایک بار ٹنڈن جی کے جواب میں مولانا نے کہا "میرے بھائی یہ آپ کا فریب تخیّل ہے" ٹنڈن جی بپھر گئے۔ حالانکہ خود اردو اچھی جانتے تھے۔ مگر پتہ نہیں کیسے یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کو فریبی سمجھا گیا ہے۔ آخر کار مولانا کو انہیں فریب

---

[1] حکیم عبدالوالی صاحب ایڈیٹر "معلومات" جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے مشہور حکیموں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے [2] قبیلہ بنی لحیان لانبی داڑھیوں کے لیے عرب میں مشہور تھا۔

تخیل کے معنی سمجھانے پڑے۔

جمہوریت پر یقین عالم انسانی کے لیے مساوات اور اس ملک کے باشندوں کا اتحاد ان کے لیے وقتی یا جذباتی چیز نہیں، اصول اور عقیدہ تھا۔

بلندیٔ فکر انسانیت کی اعلیٰ ترین قدروں کی پرستار تھی۔ مگر انتشار اور پستی کا نظارہ بھی کرنا پڑا اور شاید اس ماحول میں اپنے کو اَن فٹ پاکر انھوں نے کمرے کے دروازہ بند کر لیے اور تب عزیزوں، دوستوں، ساتھیوں اور ہم سب کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ رہ گیا کہ بند دروازے کی جھریوں سے جھانک جھانک کر دیکھتے رہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں کس طرح اپنا وقت گزار دیتے ہیں اور کیسے اپنی خلوت کو انجمن بنایا کرتے ہیں۔

کاش وہ علم و ادب کے شہسوار رہتے تو آج نہ جانے کتنے موتی رول گئے ہوتے اور بساط علم کے ہر مہرہ کو انہوں نے چیت کر رکھ دیا ہوتا۔ خدا بھلا کرے سیاست کا جس نے فکر و نظر کی بلندیوں پر حد بندیاں قائم کر دیں۔ قلم کی روانی روک دی۔ زبان کی خطابت تو نہ چھین سکی، مگر خاموشی میں عافیت نظر آئی۔ پروازِ تخیل کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں مگر خود ان پر کیا بیتی ہوگی یہ کوئی نہ سمجھ سکا۔

مولانا مجتہد وقت تھے۔ لکیر کے فقیر نہ تھے۔ اپنی بھرپور صلاحیتوں سے اور یاران محفل کی تنگ دامنی سے واقف تھے مگر اپنے شیشۂ دل کو بچا بچا کر رکھتے رہے اور کسی دوسرے پر ضرب کبھی نہ آنے دی۔

ایک بار دوران تقریر میں انہوں نے کہا تھا۔

"تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو ہم تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔
ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو۔
اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اُجالے کی ضرورت ہے۔"

یہ ہے ان کا پیغام حیات اور یہ ہے آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ۔

ان کی انگلیاں ضرور ہندوستان کی نبض پر رہتی تھیں مگر دل شاعر کی طرح دھڑکتا تھا۔ طبیعت اندر سے باغ و بہار تھی مگر جانے کیوں اردگرد خزاں کا عالم طاری رکھتے تھے۔

جب مصر میں خواتین نے طلب حقوق کی تحریک شروع کی تو ایک بڑا سوال علمائے کرام کے سامنے یہ تھا کہ کیا شرعاً عورت کو نمائندگی کا حق حاصل ہے۔ ہندوستان اس معاملہ میں پہل کر چکا تھا۔ عرب کے علماء اس کے خلاف تھے۔ علماء کی اس بحث کا خاتمہ مولانا آزاد کے ایک مقالہ سے ہوا۔ جس میں صرف دو نظریں پیش کر کے مولانا مغفور نے علماء کا منہ بند کر دیا اور مصر کے آئین میں عورتوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے جن کے لیے وہ لڑ رہی تھیں۔

لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ اپنی داستان حیات انہوں نے اپنے قلم سے کیوں نہیں لکھی پروفیسر ہمایوں کبیر سے انگریزی میں کیوں لکھوائی؟ اور ان کے غیر مطبوعہ مسودے کیا ہو گئے؟ ایک سوال اور ہے کہ اب تک مولانا کی تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف تقریریں اکٹھی کیوں نہ ہو سکیں؟ کیا کوئی صاحب قلم اس طرف رجوع کرے گا۔

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"

شاستری جی

ایک فارسی مثل ہے "ہر کہ بہ قامت کمتر بہ قیمت بہتر۔" شاستری جی کا چھوٹا قد منحنی جسم، نرم مزاجی اور غیر معمولی انکسار دیکھ کر اکثر مجھے یہ مثل یاد آتی رہی۔

یادوں کے اس ذخیرے میں اس وقت کیسی کیسی عظیم الشان ہستیاں نظر آ رہی ہیں۔ کس کس کو یاد کروں اور کس کس کا ماتم کروں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

بیسویں صدی کی ابتدا سے ہندوستان کا ایک مردم خیز دور شروع ہوا اسٹیج پر انسانیت۔ تدبر۔ بہادری اور استقلال کے کیسے کیسے نمونے ابھرے۔ اور سب تہہ خاک ہو گئے۔ سب نے اپنی اپنی ڈیوٹی پوری کی، اپنے کام انجام دیے اور خاک بسر ہندوستان کو عرش نشین بنا کر چلے گئے۔

گاندھی جی کے لیے مجازؔ نے کہا تھا ؎

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کو ڈھونڈھتا ہوا انساں چلا گیا

لیکن گاندھی جی نے تو انسان بنانے کی کوشش بھی کی تھی اور اس خاک کے ڈھیر سے چن چن کر موتی بھی نکالے تھے جواہرات بھی چنے تھے۔ وہ اکبر اعظم نہ تھے جو

نورتن اکٹھے کرنے۔ انہوں نے تو خاک کے پتلوں کو گراں جانی اور ایثار و صداقت کا سبق دے کر ملک کے گوشہ گوشہ میں انسانیت کو جگایا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو "خاک را بہ نظر کیمیا کنند" آج بھی جو دو چار چہرے بڑے انسان، چند فہم و فراست کے پتلے چند سچے اور کمائے ہوئے آدمی نظر آتے ہیں وہ بھی انہیں کی دین ہیں۔ اور شاستری جی بھی انہیں میں سے ایک تھے۔

الہ آباد میں ۳۶ء تک شاستری جی کا نام سنتی رہی مگر قریب سے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ لیکن لکھنؤ میں جب شاستری جی آئے، ٹنڈن جی کے شاگرد رشید، پنت جی کے معتمد خاص، جواہر لال جی کے رفیق کی حیثیت سے تو بہت جلد اپنے ساتھیوں میں مقبول بن گئے۔

شاستری جی کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ کانگریس کے عہدے دار ہوں یا منسٹر یا ممبر اس قدر فروتنی سے ملتے تھے جیسے وہ معمولی والنٹیر ہوں۔ میووں سے بھری ہوئی شاخ کی طرح وہ ہمیشہ جھکے ہی رہتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ آگے چل کر وہ کیا کریں گے۔ ایک وفادار سپاہی، گہرے اور ٹھوس ورکر اور قابل اعتماد ساتھی کی حیثیت سے تو سب ان سے واقف تھے لیکن یہ کسی کو بھی اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنے اہم ملکی مسائل سے بھی نپٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

۵۲ء میں جب قدوائی صاحب دہلی بلائے گئے تو یو پی کی ہوم منسٹری شاستری جی کو سپرد ہوئی۔ کہتے ہیں انہوں نے اسی شرط پر دہلی آنا منظور کیا کہ شاستری کو ہوم دیا جائے تو وہ چلے آئیں گے اور یہ حقیقت ہے کہ رفیع صاحب کے یو۔پی سے چلے آنے کے بعد اتنے پر آشوب دور میں شاستری جی اس عہدے کے پورے اہل ثابت ہوئے۔

ان کے ایثار و صداقت کا ایک اندازہ اس وقت ہوا، جب انھوں نے ریلوے منسٹری سے استعفیٰ دیا اور پھر ان کی ہمت و استقلال کا امتحان اس وقت ہوا جب ہند و پاکستان کی جنگ میں ملک کی آن بان قائم رکھتے ہوئے اپنے عزم مصمم کا اعلان

انھوں نے کیا لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ان کا فطری رجحان زندگی بھر کا عقیدہ اور سچی خواہش یہ تھی جس کا مظاہرہ آخری دم ہوا ہے۔

اللہ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے اس کے لیے ماحول اور ہمت سبھی کچھ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی مصلحتیں وہی جانے، بھلا کوئی سوچ سکتا تھا کہ شاستری جی اپنے عین عروج پر پہنچ کر ایک اہم فیصلہ کرتے ہی اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔ اور امن و شانتی کے قیام کی ذمہ داریاں نیا جانشین اٹھائے گا۔

ان سے مل کر ان سے باتیں کر کے ان پر کام چھوڑ کر اور معاملات ان کے سپرد کر کے یہ بھروسہ ہوتا تھا کہ وہ اس کو پورا کیے بغیر چھوڑنے والے نہیں۔ دن جتنے بھی لگ جائیں لیکن فیصلہ انصاف کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

خوبیاں رہ رہ کر نمایاں ہوئیں۔ شخصیت دب دب کر ابھری اور صلاحیتیں اتنے نیچرل طریقے سے ظاہر ہوئیں کہ ان کے پرانے ساتھی تک متحیر رہ گئے اور ان کی موت نے تو بالکل ششدر کر کے رکھ دیا کہ ؂

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

جانے والے چلے جاتے ہیں اپنے پیچھے یادیں چھوڑ جاتے ہیں، ایسی یادیں جن کے تصور سے دل دہل اٹھتا ہے۔ ایسی یادیں جو اندھیروں میں سے ابھر ابھر کر کہتی ہیں کیا تم ہمارے بغیر روشنی پا سکو گے؟ کیا تم ہم سے روشنی مستعار نہ لو گے؟ کیا تم ہمارے ادھورے کام پورے نہ کرو گے؟

ایسی یادیں جنہیں ہم جیسے "انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو" اور پھر چتائیں جل اٹھتی ہیں۔ ان کے شعلوں سے بجھے ہوئے دل جلنے لگتے ہیں۔ گھٹا ٹوپ گھور اندھیرا دور ہو جاتا ہے اور دیس کے ذرے ذرے میں ایک نئی قوت عمل جاگ اٹھتی ہے اور جوت سے جوت روشن ہوتی ہے۔

سجاد ظہیر کی سالگرہ کے موقع پر

(جنوری ۶۶ء)

کیا کروں بے اللہ میاں کا نام لیے مجھ سے بات ہی نہیں کہی جاتی۔ بھلا اس وقت کیسے ہیں اپنے خدا کا شکر نہ ادا کروں جس نے بنّے میاں جیسے سرپھرے جوانوں کو پھانسی کے پھندے سے محفوظ رکھ کر، جیل کی صعوبتوں سے چھڑا کر، جلا وطنی اور غریب الوطنی سے بچا کر، اور آفات ارضی و سماوی کے طوفانوں سے پار کر کے زندگی کے ساٹھ سال عطا کر دیے۔

اب بھی کسی کا جی چاہے تو لال۔ پیلے۔ نیلے۔ کسی بھی تھانے میں رپٹ لکھوا دے بقول اکبر الہ آبادی ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

لیکن میں تو یہی کہتی رہوں گی کہ اس مالک نے اپنی رحمت سے نوازا۔ ان کی مرتی ہوئی ماں کو ان کا دیدار کرایا جنھیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جانے کب یہ تختۂ دار پر چڑھ کر انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا دیں، اور پھر آپ جانتے ہیں کیا ہوتا۔ کیا یہ روح ساٹھ برس تک ٹھیٹھی رہتی۔ کوئی ہم جیسوں کی روح بھی نہ

تھی، جو اطمینان سے جزا سزا جنت دوزخ کا انتظار کرتی۔ یہ تو ماڈرن قسم کی ہلکی لطیف روح تھی۔ کب کی ہوا میں تحلیل ہو گئی ہوتی یا پھر ہفتا قالب بدلتی۔ بقول رومی ؎

مثل سبزہ بارہا روییدہ ام

اللہ نے بڑی خیر کی۔ ہر بری ساعت ٹل گئی اور آج ہم ان کی ساٹھ سالہ سالگرہ منا رہے ہیں۔ ڈاکٹر ادھیکاری نے ابھی کہا کہ ساٹھ برس کی عمر میں دماغ تیز اور شریر کمزور ہو جاتا ہے لیکن یو۔پی کے گاؤں میں دو مثلیں کہی جاتی ہیں۔ "مرد ساٹھا اور پاٹھا" دوسرے "سٹرا اور بہترا۔" سو بھی انشاء اللہ دس سال بعد بنّے میاں سترے اور بہترے ہوں گے اور تب پھر آپ لوگ اپنے پیر مغاں کی سالگرہ منائیے گا۔

کامریڈ سجاد ظہیر صاحب، ترقی پسند ادب کے بانی مبانی، ہندوستانی کمیونسٹوں کے پیر اور بزرگ، کانگریسیوں کے چہیتے، آوارہ گردوں کے پیشوا اور باغیوں کے سربراہ سہی، مگر سچ پوچھیے تو اپنے اندر کچھ ایسی انفرادی خصوصیات رکھتے ہیں۔ کہ ہر ملنے والا ان کا گرویدہ ہو ہی جاتا ہے۔ ترقی پسندی کی کوئی علامت تو ان میں ہے نہیں۔ نہ تو ان کا چہرہ کبھی ہونّق رہا۔ نہ بال اُلجھے، نہ ٹوٹے جوتے گھسیٹے۔ نہ ملگجے کپڑے پہنے۔ نہ بات کرتے کرتے مرنے مارنے پر آمادہ ہوئے، ہمیشہ مصلحت کی بات اور مزاج ایا نہ اور ابر قرار رہی ہے۔ ہندوستان ایشیائی ملک ہے اور کھچڑی کھاتے دالا دیس ہے۔ یہاں جس طرح دال اور چاول ملتے ہیں اسی طرح تمام مذاہب ملے اور اسی طرح ساری دنیا کے قوانین کا مکسچر دستور ہند کی شکل میں تیار ہوا اور اسی طرح نئی کھچڑی بھی پک رہی ہے تو یہ بات کرتے کرتے نہ جانے کہاں نکل آئی۔

ہاں تو ذکر تھا بنّے میاں کے ٹیپ ٹاپ سے درست رہنے کا، انہوں نے کبھی

میری دعا ہے وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوں جس میں ایسا سماج بنانے کی آرزو ہے جہاں بھرپور انسانیت ہو، امن ہو، مساوات ہو اور پھر میری آخری تمنا یہ بھی ہے کہ

"بگذر از لاجاتب الآخرام"

صالحہ عابد حسین

"زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب" اور یہ ترتیب جب اتنے حسین اور متضاد عناصر کے ساتھ ظہور پذیر ہو تو جی چاہتا ہے قدرت کے ہاتھ چوم لوں۔ کیسا بھاری بھرکم ثقیل قسم کا نام "مصداق" کام سنجیدہ قسم کی کہانیاں لکھنا، افسانوی نام صالحہ۔ فاؤسٹ کے مترجم کی اہلیہ محترمہ۔ اجزائے حیات کا تجزیہ کرو تو عناصر اربعہ کے علاوہ، سرمہ لونڈر، صندل، ہارسنگھار کے ساتھ نمک اور گلقند آفتابی بھی ملا ہوا نظر آتا ہے۔ وہی ہلکا نیلگوں یا سرمئی شیڈ والا کنھیا جیسا صندلی رنگ، ہارسنگھار کی ڈنڈیوں والا پیلا پن اور خوشبو، لونڈر کی مہک، نمک کی ملاحت اور گل قند و خمیرہ کی بخشی ہوئی طاقت۔

بہت چپکے چپکے کچھ لکھتی رہتی ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پڑھ کر سنا دیتی ہیں۔ اور ہولے ہولے زندگی میں مٹھاس گھولتی رہتی ہیں۔

سنہ ۴۲ء میں پہلی بار جامعہ کے عجائب گھر میں ایک بالاخانہ پر مجھے نظر آئیں نام سے بخوبی واقف تھی۔ عابد صاحب سے بھی غائبانہ ہی تعارف تھا۔ ان کی کئی کہانیاں پڑھ چکی تھی۔ اور نہ جانے کیوں سوچ رکھا تھا کوئی بڑی عقل مند قسم کی بھاری بھرکم عورت ہوں گی۔

لیکن پاس جا کر دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ بے اختیار دل سے دعا نکلی اللہ زندہ سلامت رکھے اور عابد صاحب کا گھر آباد رہے۔

دبلی پتلی کنواری نما بیاہی عورت، جو اپنی عمر سے پندرہ برس چھوٹی دکھائی دیتی تھیں۔ نزلہ زکام کی مریض، اس پر کتابوں کی کیڑا۔ اتنی خیریت تھی کہ لکھتی کم تھیں بولتی زیادہ تھیں اور چلتی کبھی کبھار تھیں، ورنہ اللہ جانے کیا ہوتا۔

مُنہ چھپانے کی عادت میری بھی تھی، وہ مجھ سے زیادہ دیر آشنا نکلیں۔ بہت دنوں تک رسمی طریقہ سے ملنا ہوتا رہا، اور خیریت خیر صلاّ پوچھ کر ہم نے ایک دوسرے سے اپنے آپ کو بچائے رکھا، لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی، آخر ایک دن پہچاننا ہی پڑا۔ پھر جو جی کھول کر ملاقات ہوئی ہے تو اب تک ہوتی ہی چلی جا رہی ہے۔ لگتا تو ایسا ہی ہے کہ یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ سب سے زیادہ حیرت ان کا نام سن کر ہوئی اور میں نے طے کر لیا، یہ نام لینا ان کے بھائی جان کو مبارک رہے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ صالحہ بننے کے بعد تعارف ہوا۔

جتنی پیاری زبان لکھتی ہیں، اتنی ہی بولتی بھی ہیں۔ مشرقی معاشرت اور مغربی لٹریچر میں ایسا خوبصورت تال میل انہوں نے پیدا کر لیا ہے کہ گھر میں قدم رکھتے ہی انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ کہاں بیٹھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ڈرائنگ روم میں صوفے پر یا صحن میں پڑی ہوئی بان کی کھرّی چارپائی پر یا ان کے کتابوں رسالوں سے بھرے ہوئے کمرہ میں مسند تکیہ سے لگ کر۔ ویسے پہلی نظر میں تو وہ ایسی اپنے کو لیے دیے ہوئے نظر آتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی ہوں گی۔ تہذیب کا ایسا مجسمہ بن کر بیٹھتی ہیں کہ ڈر لگتا ہے کہیں کوئی لفظ خلاف محاورہ یا خلاف تہذیب نہ نکل جائے، جو ان پر گھڑوں پانی پڑ جائے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میرے گنوارپن کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتی ہیں۔ شاید یہ بھی میری عمر کا لحاظ کر کے بربنائے تہذیب ہو۔

نئے آدمیوں کی عریاں پسندی اور فحش نویسی پر اتنے لطیف الفاظ میں تبصرہ کرتی ہیں کہ کسی جملہ کو دُہرائے بغیر بھی سننے والا نفس مضمون کی پستی سے واقف ہو جاتا ہے۔

ان کی عافیت پسندی نے بہت سے لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنا گوشۂ عافیت الگ بنا رکھا ہے۔ بعض وقت جب انہیں کسی کی شادی کا لحاف سیتے کسی کی چوتھی کا جوڑا تیار کرتے یا مجلسوں کا اہتمام کرتے دیکھو تو بالکل سیدھی سادی قصباتی بیوی نظر آتی ہیں۔

کوئی خلیرا ماموں ہے تو کوئی چچیرا بھانجا، کوئی بہن کی بچی ہے تو کوئی میری تیری کسی کی بھی۔ لیکن چابک دست اتنی بڑی ہیں کہ کسی کو میری بچی کہہ کر گلے لگایا تو کسی کی میرا بیٹا کہہ کر پیٹھ تھپکی کسی کے کھانے کو پوچھا تو کسی کی دوا کو۔ اور لاڈ پیار کر کرا کمرہ سے بھگا کر دروازہ بند کر لیا۔ باہر کا شور و شغب انہیں پسند نہیں ہے لیکن گھر کے اندر کا غل غپاڑہ کچھ ایسا برا بھی نہیں لگتا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے کمرہ میں مضبوط چٹخنی لگا رکھی ہے اور الماریوں میں کتابیں بھر رکھی ہیں تاکہ تنہائی میں دوسرا مخل نہ ہو سکے۔ اور وہ کہہ سکیں "ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو۔" لیکن مارے رشک کے میرے دل سے آہ نکل جاتی ہے۔ کاش مجھے بھی اس عافیت کوشی کا سلیقہ ہوتا — ویسے ان کا اصول پرانی بیویوں کی طرح یہی ہے کہ آپ بھلا اپنا گھر بھلا۔ لیکن عابد صاحب کا شوق صحرا نوردی پچھلے دنوں ان کو بھی جرمن گھسیٹ لے گیا۔ اللہ کا شکر ہے وہ جیسی گئی تھیں ویسی ہی لوٹ آئیں۔

صالحہ نہ دروغ مصلحت آمیز کی قائل ہیں نہ راستی فتنہ انگیز کی، اس لیے سوچ سمجھ کر تلی تلائی بات کہتی ہیں۔ اقبالؔ کی طرح وہ اس کی بھی تعریف نہیں کرتیں کہ "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق" لیکن ان کی عقل "محو تماشائے لبِ بام" بھی نہیں رہتی بلکہ وہ یہ اندازہ کرتی رہتی ہے کہ اس زینہ میں کتنی سیڑھیاں ہیں اور کتنا وقفہ اس پر

چڑھنے اور اترنے میں صرف ہوگا اور وہاں پہنچ کر گرد و پیش کے لیے کیا کیا مناظر دیکھے جا سکتے ہیں اگر ہاتھ میں دوربین بھی ہو!

اپنی چادر میں وہ اتنی نفاست سے پاؤں پسارتی ہیں کہ کیا مجال جو ایک انگلی بھی کھلی رہ جائے اور چادر پھٹنے بھی نہیں پاتی۔

نزاعی مسائل میں ان کی عافیت پسندی کوئی ایسا کونہ سنبھال لیتی ہے، جہاں بیٹھ کر وہ سب کو دیکھ بھی سکیں اور دونوں فریق سے بے نیاز ہو کر مطمئن بھی رہ سکیں۔

اللہ جلّ شانہٗ نے انہیں حسنِ نظر عطا کر دیا ہے، اس لیے انہیں ہر چیز خوبصورت نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ حسن کا کوئی جنچا تلا معیار اب تک انہوں نے بنایا نہیں ہے۔

اپنی ہر کہانی کو کلیجے سے لگا کر رکھتی ہیں اور دوسروں کی ادبی کاوشوں کو بھی سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہیں بشرطیکہ اس میں کوئی فنّی نقص نہ ہو۔

بحیثیت انسان کے ان میں کوئی نقص ڈھونڈنے پر بھی نہیں مل سکتا۔ اتنے برسوں ملتے رہو، ان کی خوش مذاقی، خوش اخلاقی، سادگی اور تہذیب مسحور کرتی رہے گی لیکن برسوں کی ملاقات کے بعد بھی یہ کہنے پر مجبور رہنا پڑے گا ؎

نظر آتا ہے کوسوں سے کسی کا آستاں مجھ کو

لیکن جس وقت پیاری پیاری بولی بولتی ہوئی آ تر پڑتی ہیں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ ہر بات جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ اپنے ہی دل کی نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، حالانکہ وہ دراصل کسی دوسرے کی نہیں، ان کی اپنی ہوتی ہے۔

ان کی کہانیوں پر میں کوئی تبصرہ نہ کروں گی کیونکہ ان کے کردار اتنے سادہ شریف اور مہذب ہوتے ہیں کہ ان پر تنقید کرنے والا بھی، اتنا ہی معصوم صفت ہونا چاہیے۔

کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک باپ اپنے بیٹے کو لایا کہ شکر بہت کھاتا ہے، اس کو نصیحت کیجیے۔ آپ نے فرمایا کل آنا، اس روز آپ نے خود شکر کا استعمال چھوڑا کیوں کہ میٹھا اس آپ کو خود بہت مرغوب تھی اور دوسرے دن جب پھر وہ لڑکا آپ کے سامنے لایا گیا تو اس کو نصیحت کی۔

سو بھئی اس معاملہ کو تو اگلے سال پر اٹھا رکھیے، ذرا اپنے کو اس قابل بنا لوں تو تبصرہ کروں گی۔

غالبؔ کے انداز بیان اور اردوئے معلّٰی کو ایک ظالم پانی پت کے انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ کر لے گیا تھا۔ یہ بھی پانی پت کی رہنے والی ہیں اور اس لوٹ میں سے اُن کو بھی حصہ ملا تھا۔ اردو زبان سے عشق ہے۔ فطرت ایسی ٹھیٹھ نسوانی ہے کہ کہانیوں میں ہر جگہ عورت ہی کا دل دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ادھر مولانا حالی اور خواجہ غلام الثقلین کا ترکہ بھی پا گئیں، صالحہ عورت تھیں اس لیے دل کی دھڑکن آنکھ کے آنسو فطرت سے لے کر آئی تھیں، غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنی بھاری چیزوں کو اتنی ہلکی نازک چیز میں ملا کر ایسا محلول تیار کیا جسے ہر شخص بہت پسند کرتا ہے حلق سے نیچے اتر کر تراوٹ بھی محسوس ہوتی ہے مگر نیند آنے لگتی ہے، جسم میں چستی پھرتی نہیں پیدا ہو پاتی۔ ممکن ہے آگے چل کر اتنی سی خامی بھی باقی نہ رہے۔

ویسے خاصی بھلی دلکش آدمی ہیں، بس ذرا عقل مند ضرورت سے زیادہ ہیں اور محتاط پرلے درجہ کی۔

حُسن مسرّت ہے یا غم

نٹشے کہتا ہے

"شریف ترین حسن وہ ہے جو یکایک ہم کو بے بس نہ کر دے آہستہ آہستہ ہمارے ذہن میں اپنی گنجایش پیدا کرتا رہے اور جسے ہم غیر شعوری طور پر قبول کرتے رہیں۔"

ذرا اس فلسفیانہ حماقت کو دیکھیے۔ بھلا وہ حسن ہی کیا ہوا جو پھونک پھونک کر قدم دھرے۔ ایک ذرا سا دماغ اس پر یہ غرّہ۔ وہی میر تقی میر والی بد دماغی "سرہانے میر کے آہستہ بولو"۔ حسن جس نے کائنات پر چھا کر، ہواؤں میں گھل کر، ذرہ ذرہ میں چمک کر اور زمین پر چلتی پھرتی بجلیاں بن کر ہمیشہ انسان کے دل و دماغ سے اٹھکھیلیاں کی ہیں۔ شریف و رذیل کے پھیر میں تو پڑتا نہیں۔ دروغ بر گردن راوی سنتی ہوں سقراط کو بھی اپنے دل کی کمزوری حکیمانہ چالاکی ہی میں چھپاتے بن پڑی تھی۔

حسن آفرینش عالم سے پہلے بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں کہ جب انسان پیدا ہوا تو۔

"نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

کھردرے شکّی فلسفی لاکھ حسن کے وجود سے انکار کریں وہ آج بھی دنیا کی

کائنات پر راج کر رہا ہے۔ بس نظروں کا فرق ہے۔ کسی کو

"اپنا ہی عکس رخ نظر آیا قریب سے"

اور کسی نے یہ کہہ سمجھ کر دل کو تسکین دے لی۔

میں سایہ ہوں وہ بھی سایہ ہے
میں دھوپ نہیں وہ دھوپ بھی ہے

رہے قنوطی تو ان کا کیا پوچھنا۔ دلکشی کی طرف سے تو ہمیشہ ان کی آنکھیں پٹ ہی رہتی ہیں۔ ہاں قبر اور کفن کی بو بڑی تیزی سے ناک میں گھس جاتی ہے۔ اچھے بھلے جیتے جاگتے حسن کی تہ میں بھی انہیں کیڑے بلبلاتی لاش نظر آتی ہے۔ اپنا اپنا ظرف ہے اور کیا کہا جائے۔

اس سائنٹفک دور میں جب کہ زمین و آسمان کے تمام اجزا کی چھان بین ہو رہی ہے اور کائنات کے چھلکے پیاز کی گنٹھی کی طرح اُدھیڑے جا رہے ہیں حسن پر بھی خوب خوب ریسرچ ہوئی ہے۔ کسی کی دریافت ہے۔

"اک ستارہ، اک کلی، اک مے کا قطرہ ایک زلف" حسن کے عناصر اربعہ ہیں۔

کسی کی کاوش فکر ہے ستاروں کی افشاں، سورج کا سندور اور نور کی لہریں اکھٹی کر کے حسن کا مکسچر تیار ہو سکتا ہے۔ تیسرے سائنس داں کا خیال ہے۔

قوس قزح کی کمان، پورنماشی کی چاندنی، برسات کی گھٹا۔ اور ریشم و کمخواب کے ہجوم کو پھولوں کے رنگ و بو میں ملا کر حسن کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔

ان سب کو اپنے خبط میں مبتلا رہنے دیجیے۔ مجھے نہ کسی کی تصدیق سے واسطہ نہ تردید سے۔ یہاں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ درحقیقت حسن مسرت ہے یا غم۔ مسکراہٹ ہے یا آنسو؟ اب نیچر ہی کے بے پناہ حسن کو لے لیجیے۔ کیا اس میں کچھ کم رعنائیاں اور دلفریبیاں ہیں کہساروں کی ہریالی، سمندر کی موجیں، اودی اودی گھٹاؤں کے

نیچے کائنات کا مستانہ وار رقص، کشمیر کے مرغزار، پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں، چاندی کی طرح چمکتی ہوئی جھیلیں، غرض تمام قدرتی مناظر اپنا اپنا خزانہ اس دنیا پر لنڈھا دیتے ہیں اور ہم سب یکساں خوشی و سرمستی کی موجوں میں ڈوب کر ان مسرتوں سے اپنا دامن بھر لینا چاہتے ہیں۔ ایسے وقت میں غم پاس بھی نہیں پھٹکتا، کسی خاص واقعہ کے اثر سے اس فضا اور اس ماحول میں بھی وقتی طور پر رنجیدہ ہو جانا دوسری بات ہے۔

قدرت کی صناعیوں کے علاوہ خود انسان کے شاہکار ہیں۔ آرٹ اور صنعت کا کوئی نمونہ دیکھ کر کیسا جی لوٹ جاتا ہے۔ حسین مجسمہ ہو یا خوبصورت عمارت، اچھا شعر ہو یا بہترین تصویر سب سے ہماری خوشی میں اضافہ ہوتا ہے۔

جب بے جان چیزوں کو دیکھ کر طبیعت مچل جاتی ہے تو پھر جاندار کا کیا پوچھنا کوئی پیارا سا خوبصورت بچہ نظر آجائے تو مرد عورت جوان بڈھے سب کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ خشک مزاج صوفی ہو چاہے دماغ دار عالم، رنگین مزاج شاعر ہو یا رند لاابالی، سب یکساں کھلے دل سے فطرت معصوم کے اس شاہکار کی آؤبھگت کرتے ہیں، مسکراتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے یہ تک بھول جاتے ہیں کہ اس کی ذات کیا ہے۔ مذہب کون سا ہے۔ کس قوم سے ہے۔ امیر ہے یا غریب۔ بچہ کا سادہ اور معصوم حسن ایسے رکیک خیالات پیدا ہونے کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ اس وقت ان کے ارد گرد صرف مسرت ہوتی ہے بے حد و بے نہایت خوشی، پاک اور معصوم خوشی۔

آدمی کی طبیعت کا تو کچھ عجیب ہی حال ہے۔ اس کی اپنا لینے اور قابض ہو جانے والی فطرت نہ اسے جی بھر کر خوش ہونے دیتی ہے نہ چین لینے دیتی ہے۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ انسانی حسن کا شباب و کمال بالکل ہی مختلف قسم کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ مناظر قدرت پر تو بے لوث نظریں پڑ سکتی ہیں۔ بچہ کا

ستھرا حسن بے غرضی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن خوبصورتی کے کسی جیتے جاگتے جوان مجسمہ کو بلا طلب و تمنا دیکھنا بس کی بات نہیں۔

اگر حسن و مسرت لازم و ملزوم، اگر خوبصورتی کا آغاز و انجام خوشی ہی خوشی ہے تو پھر ارمانوں کی یہ ہلچل، تمناؤں کی یورش، ہوس کی افراط اور یہ موہوم سی کشمکش اس ساری خوشی کو غارت کر کے کیوں رکھ دیتی ہے۔

مسرت کی جگہ رنج۔ دکھ اور جلن حاصل ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں طبیعت مگن ہو تو ہر طرف حسن بکھرا ہوا، رعنائیاں پھیلی ہوئی اور انگڑائیاں تنی ہوئی نظر آتی ہیں مگر نہ جانے بعض وقت کیا ہو جاتا ہے کہ سب کچھ نوچ لینے۔ پھونک دینے اور تباہ کر ڈالنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ اب چاہے اسے "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کہہ لیجیے یا انگور کھٹے ہیں سمجھ لیجیے۔ جب جوانی طفلی سے گلے ملتی ہے اور جب مہ نو چودھویں کا چاند بنتا ہے تو دیکھنے والوں پر بالکل ہی مختلف قسم کے اثرات طاری ہوتے ہیں۔ اب اس حسین مکھڑے کو دیکھ کر کوئی مارے خوشی کے دیوانہ ہو جائے گا اور کسی کو آہیں بھرنے کی سوجھے گی کوئی لاحول پڑھ کر منہ پھیر لے گا اور کوئی کہے گا ؎

وہ چہرہ ہے پری نور کہ اللہ کی قدرت
وہ آنکھ ہے مخمور کہ حافظ کی غزل ہے

بہتیرے گریبان چاک خاک بسر نظر آئیں گے اور کوئی صاحب منہ پکا کر کے نصیحت فرمائیں گے۔

تو بنا پجاری مایا کا اور تتو سے کی آنا کانی"

شاعر کہے گا "بہار حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمہ" اور کوئی افلاطون پکار اٹھے گا۔ "بے انتہا خوبصورتی بھی دنیا کے لیے بد ترین لعنت ہے۔"

غضب تو یہ ہے اپنی ہم جنس کی خوبصورتی دیکھ کر بھی تو جی جل کر کباب ہو جاتا ہے۔ اپنی کس مپرسی اور حسن کی یہ آؤ بھگت دیکھ کر جی چاہتا ہے، یہ کالا کلوٹا چہرہ لے کر اللہ میاں کے فرشتوں پر پھینک آئیں۔ ایک ذرا سا خمیرا ور چوکھا کر دیتے تو کیا ہاتھ گھس جاتے۔

گھورے کی کھاد سے پیدا ہونے والے حسن کو اقتدار و عظمت کی سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھنا تو اور بھی انگاروں پر لٹاتا ہے۔

محفل میں نگاہ بھر کر دیکھو تو دل میں چبھن سی ہونے لگتی ہے۔ منہ پھیر کر بیٹھ جائیں تو کنکھیوں سے دیکھے بغیر دل نہیں مانتا ظاہر تو یہی کرنا ہے کہ ہم ایسی ویسی چیزوں پر نظر نہیں ڈالتے۔ یا پھر ہوں گی تم خوبصورت، اپنی نظر میں تو تمہارا حسن اچھا نہیں۔ مگر سب کی نگاہیں اس طرف پھری ہوئی دیکھ کر بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ جی ہی جی میں ان ندیدے مردوں کو کوسنے کو دل چاہتا ہے۔ اللہ سمجھے کیسی ٹکٹکی باندھے آنکھوں ہی آنکھوں میں نگلے جا رہے ہیں اور پھر یہ کہہ کر تسکین دے لی جاتی ہے کہ اچھا ہوا ہم خوبصورت نہیں ان منحوس نگاہوں سے تو محفوظ ہیں۔ ہر آراستہ و پیراستہ خوبصورتی کو دیکھ کر اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔

رہے مرد تو وہ اپنی خوشی اور غم کی داستانیں گلی در گلی سناتے پھرتے ہیں جو دیوان چاہے اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں جو ان کے فغاں۔ آہ۔ شیون اور نالے دہراؤں، البتہ ایک بات ہے وہ اپنی ہم جنس کی خوبصورتی پر عورتوں کی طرح جلتے نہیں۔ اکثر فخر و انبساط کا اظہار کرتے۔ بلکہ ایمانداری کے ساتھ تعریف بھی کرتے ہیں اور اس وقت تک تعریف کرتے رہتے ہیں جب تک کہ خود ان کی بیوی نہ تعریف کرنے لگے۔ لیکن اس میں حسن کا کیا قصور۔ خوبصورتی کو کیا دوش دیا جا سکتا ہے فتور ہے تو اپنی آنکھ کا اور اس بدتمیز ماحول کا جس میں مثل کہی جاتی ہے۔ ”من لگا گدھی سے تو پری کیا

چیز ہے“ حسن جو مسرت و انبساط کا خزینہ ہے اگر اسے دیکھ کر کسی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے اور کوئی اس کی جھلک دیکھتے ہی زار و قطار رونے لگے تو وہ کیا کرے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ہم جنس کی خوبصورتی دیکھیں تو ایسا دھکا لگے جیسے ایکسیڈنٹ ہو گیا اور دوسری جنس کی ہو تو بقول شاعر

مزہ لے لے کے تڑپیں نیم جاں آہستہ آہستہ

یعنی حسن تسکین کے بدلے وبال جان ہو گیا۔ نہ ٹھنڈک نہ روشنی، رنج ہی رنج اور چوٹ ہی چوٹ۔ اسی مکروہ ذہنیت نے آدمی کو ایسا عجائبات کے دریا میں ڈبو دیا ہے کہ ساحل کا پتہ ہی نہیں ملتا لیکن اس پر بھی وہ خوش ہے۔

قلزم عشق میں ہیں نفع و سلامت دونوں
اس میں ڈوبے بھی تو کیا پار اترنا ہے یہی

بہرحال اس صورت حال کے باوجود آج بھی حسن مسرت ہے۔ اب بھی وہ آنسوؤں کو جذب کر سکتا ہے۔ ہونٹ مسکرانے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔ دل کی کلیاں کھل سکتی ہیں اور مردہ جسم میں زندگی کی لہر دوڑ سکتی ہے۔

غم کے پروردگار ہم خود ہیں
یا
ہماری شامت اعمال

ریختی

کہتے ہیں ایک چور کہیں سے ایک گھوڑا چرا کر لایا اسے لے جا کر بازار میں بیچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص آیا اس نے گھوڑے کی قیمت پوچھی۔ دام طے کیے اور بولا' بھائی اچھی طرح دیکھ بھال کر خریدوں گا۔ لاؤ ذرا اس کی چال تو دیکھوں۔ چور نے اجازت دیدی۔ گاہک نے جوتے اتار کر چور کے پاس چھوڑ دیے اور گھوڑے پر سوار ہو کر پہلے اسے قدم قدم چلایا، پھر تیز قدموں سے بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگایا اور پھر جو ایڑ دی ہے تو ایسا بگٹٹ بھاگا کہ گرد نہ ملی۔ آناً فاناً نظروں سے غائب۔ چور نے شام تک واپسی کا انتظار کیا آخر لاچار ہو کر جوتے اٹھائے اور گھر کی راہ لی، راستے میں ایک دوسرے چور ساتھی سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے پوچھا کہو یار گھوڑا کتنے میں بکا۔ چور نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا' جتنے میں خریدا تھا۔ بس اتنے ہی میں بیچ دیا' یہ جوتیاں نفع میں رہ گئیں۔

سو جناب ریختی کا بھی کچھ ایسا ہی حساب کتاب سمجھیے۔ یہ بھی چھپے چوری کا اڑایا ہوا مال تھا۔ اور اس سوداگری میں بھی جوتیاں ہی نفع میں ہاتھ لگیں۔ کسی ریختی گو کو شہسوار ادب بننا نصیب نہ ہوا۔ میاں رنگین جو ریختی کا موجد اپنے کو گردانتے

ہیں اپنے دیوان کے دیباچہ میں اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ

" بیچ ایام جوانی کے یہ نامہ سیاہ اکثر گاہ بگاہ عرس شیطانی کہ عبارت جس سے تماش بینی خانگیوں کی ہے کرتا تھا اور اس قوم میں ہر فصیح تقریر پر دھیان دھرتا تھا۔ ہر گاہ چند مدت جو اس وضع پر بسر ہوئی تو اس عاصی کو ان کی اصطلاح اور محاورہ سے بہت خبر ہوئی۔"

ریختی کی اس شانِ نزول کو دیکھیے اور پھر انشاء کی بدنصیبی کا ماتم کیجیے کہ ان کا تبحر علمی، بے نظیر حاضر جوابی، خداداد ذہانت اور سیادت نسبی کوئی چیز سعادت علیخاں کے تاناشاہی مزاج کو ہموار نہ کر سکی۔ نہ اہالیان دربار کو ان کی نکتہ سنجیاں اور مضمون آفرینی محظوظ کر سکی۔ ناچار پھبتیوں، فحاشیوں، اور ضلع جگت سے سامان تفریح مہیا کیا۔ اور جب یوں بھی کام نہ چلا تو خود سامان تفریح بن کر پکار اٹھے ؎

لا دے وہی دوا مجھے ململ کی اوڑھنی
پشواز اودی اور جھلاجھل کی اوڑھنی

سچی بات تو یہ ہے سلطنت اودھ کی بنیاد ہی کچھ ایسی گھڑی اور ایسے ڈھنگ سے پڑی تھی کہ اس میں کبھی مردوں کی زیادہ ضرورت نہیں پڑی۔ شروع سے آخر تک حکمرانوں کے اعصاب پر عورت سوار رہی۔ مردانہ مشاغل سے انہیں اس لیے زیادہ واسطہ نہیں پڑا کیونکہ دلی دور تھی اور تمام آفات ارضی و سماوی دلی والوں پر ہمیشہ نازل ہوا کرتے تھے۔ بیگمات میں کچھ زیادہ جیالا پن تھا۔ بہو بیگم کی ہمت نے تو ایک بار توپوں کی باڑھ پر بھی حوصلہ مندی کا ثبوت دیا تھا مگر نواب لب و رخسار کی حد سے باہر کبھی نہ گئے اور آخر میں تو جان عالم بن کر کلیجہ پر سانپ لوٹا گئے۔ سنتی ہوں اودھ میں ان دنوں الٹی گنگا بہا کرتی تھی اور اس میں آتش جیسے دو ہی ایک شاعر تھے جو ادیچی بن کر تیرے، ورنہ زیادہ تر خم محراب ابرو میں سر بسجدہ رہے۔

وہ تو کہیے لکھنؤ میں زندگی اور مردانگی کی رمق باقی رکھنی خدا کو منظور تھی جو میر انیس پیدا ہو گئے اور مع گھوڑے کے پانچوں ہتھیاروں کا نام یاد رہ گیا ورنہ ان انگریزوں سے کام تھوڑی چلتا۔ فرشتہ ہی آ کر اودھ کا تختہ لوٹتے۔

انشاء کی بدقسمتی تو یہ تھی کہ وہ تنزل و انحطاط کے اس دور میں لکھنؤ آئے جب حکومت و عزت کے ساتھ اخلاقی قدروں کا بھی جنازہ تیار ہو رہا تھا۔ دوسری یہ کہ دربار اودھ سے وابستہ ہو گئے جہاں فضل و کمال سے زیادہ لطائف و ظرائف کی قدر تھی اور نکتہ سنجی سے زیادہ معاملہ بندی کی۔ دربار کی اس زنگ آلودہ فضا سے وہ متاثر ہوئے یا آقائے ولی نعمت کے حسب مذاق چیز پیش کر کے سرخروئی حاصل کرنا چاہی، جو بھی ہو، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد بھی معتوب بارگاہ ہوئے اور تب اپنے حقہ سمیت سایۂ دیوار بن کر بیٹھ رہے اور ایڑیاں رگڑ کر جان دیدی۔

لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی سوال تو یہ ہے کہ آخر ریختی ہے کیا بلا؟ کہتے ہیں جب چیونٹی مرنے پر آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں اور شاعر کو جب موت گھیرتی ہے تو ریختی کہنے لگتا ہے۔ رنگین نے بھی انشاء پر طنز کیا ہے ؎

موا انشا بھی اب کہنے لگا ہے
یا چہ خوش چیونٹی کے اب ہوئے پر

میرا خیال ہے سچ مچ انشاء پر موت سوار ہو گئی تھی اور اسی لیے وہ ریختی کی طرف متوجہ ہوئے۔ رنگین شاعر تو تھے نہیں وہ جو چاہتے کہتے لیکن انشاء شاعر تھے اور ریختی یقیناً شاعر کی موت ہے۔

عام طور پر یہ غلط فہمی ہے کہ ریختی عورتوں کی زبان میں انہیں کے جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے لیکن مجھے اس میں شبہ ہے بلکہ شاید اس معیار پر وہ اس زمانہ میں بھی پوری نہیں اتری جب محفلوں میں اس کا دور دورہ تھا اور حاضرین

محفل بڑھ چڑھ کر داد سخن دیتے تھے۔ یقیناً وہ باتیں گھریلو ماحول سے بالکل مختلف ہوں گی اور یہ معاملہ بندی کسی مخصوص فرقہ سے متعلق ہوگی، عوام و خواص کی بہو بیٹیوں سے نہیں۔ ورنہ وہ شرفا جو بیویوں کی آواز بھی مردانے مکان میں کیا، صحن خانہ تک پہنچنا گوارا نہیں کرتے تھے بھری محفل میں یہ رسوائیاں کیسے برداشت کرتے۔ اس معاملہ میں بھی رنگین ہی کے بیان کو سند سمجھنا چاہیے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اصطلاح و محاورے ان کو پری خانوں میں ازبر ہوئے تھے آگے چل کر اور بھی زیادہ یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔

"پس واسطے خوشی ان اشخاص عام بلکہ خاص کی بولیوں کو ان کی زبان میں ہیچمدان نے موزوں کر کے دیوان ترتیب دیا۔ بقول شخصے گندہ بروزہ باخشکہ خوردن ہر چند کہ گندہ مگر ایجاد بندہ" لیکن اس دیوان میں لغات و محاورات ایسے نظم ہوئے تھے جو اکثر یاروں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے۔ ناچار وہ جو دقیق الفاظ تھے ان کو بندے نے اس دیباچہ میں اس طور سے شرح کر کے لکھ دیا کہ کسی لفظ کے معنی پڑھنے اور دیکھنے والوں سے رہ نہ جائیں۔"

ظاہر ہے وہ اشخاص عام یا خاص کوئی اور ہی ہوں گے۔ گھریلو عورتیں نہیں ہو سکتیں۔ ورنہ ان کی گفتگو تو ہر مرد سمجھتا ہے۔ اپنی ماں بہنوں بیویوں کی زبان پر چڑھے ہوئے محاورے اتنے اجنبی تو نہیں ہو سکتے کہ شرح اور لغت کی ضرورت پڑے۔ اسی طرح یہ بھی یقین ہے کہ وہ زبان جن کی تھی جذبات و احساسات بھی انہیں کے تھے۔ اور سوسائٹی و ماحول بھی انہیں کا ہوگا۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا ہماری دہلی اسٹیٹ گورنمنٹ کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے شبستانوں پر دھاوا بول دیا اور قطعی ارادہ کر لیا کہ زبان و تہذیب کی وہ درس گاہیں جہاں اب سے تیس سال پہلے تک رؤسا کے لڑکے علم مجلسی حاصل کرنے جایا کرتے تھے۔ یک قلم مٹا دی جائیں۔ خیر پہلا گروہ جو بقول انشاء ڈیڑھ سو سہاگ بھری ہستیوں پر مشتمل تھا

کے شفا خانہ پہنچا تو ان نوخیز اجنبیوں کو دیکھنے سارا شہر امنڈ پڑا۔ سوشل ورکر کی حیثیت سے میں بھی کئی بار وہاں گئی اور اب رنگین و انشاء پڑھنے کے بعد خیال آتا ہے کہ غصہ اور طیش میں بھری ہوئی جب وہ ہمیں گورنمنٹ کو اور پولیس کو گالیاں دیتی تھیں تو یہی زبان بولتی تھیں جو رنگین انشاء اور جان صاحب کی ہے اور اسی قسم کے کردار خیالات اور کہانیاں ان کی تھیں جس پر برہم ہو کر میری کئی دوستوں نے ان سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا اور تجویز پیش کی تھی کہ انہیں قید تنہائی کی سزا دی جائے پستی کی اس انتہا کو دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور یہ سوچ کر انسان سے نفرت ہونے لگی تھی کہ یہ گر کر تنزل کی اس انتہا تک بھی پہنچ سکتا ہے جو حیوانیت سے بھی نیچی ہے اس وقت ہمیں ان کے تند و ترش جملوں کے سمجھنے میں انتہائی وقت پیش آتی تھی۔

یہ خبر نہ تھی کہ ریختی پر مقالہ لکھتے وقت انہیں کانٹوں سے الجھنا پڑے گا پھول اور کلیاں دوسروں کے حصہ میں آئیں گی اور کباڑ مجھ سے سمٹوایا جائے گا خیر صاحب کانٹا ہی سہی۔ "پالا ہوا ہے یہ بھی نسیم بہار کا" اس لیے وہ بھی اپنے چمن کی چیز ہے۔

انشاء کی ریختی، چوں کہ غیر فطری اور ماحول کے ابتذال کا نتیجہ تھی۔ اس لیے انتہائی بھونڈے لب و لہجہ میں بہت ہی سطحی اور عامیانہ ہے زبان کے اعتبار سے بھی وہ نا قابل توجہ ہے نہ اس میں نسوانی لوچ و ترنم ہے نہ سادگی، تشبیہ و استعارے بھٹیارنوں کے ہیں۔ ان کی لکڑ توڑ ریختی صاف پتہ دیتی ہے کہ کہنے والے نے چھپ چھپا کر چند بول اڑا لیے ہیں اور کل کا ئنات بس اتنی ہی ہے۔ معاملہ بندی میں بھی وہ مرد ہی رہے عورت نہ بن سکے بعض وقت اس ماحول میں ان کا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے اور اکثر حصول لذت کی طلب بھی نمایاں ہے۔ انشاء شاعر تھے رنگین کی طرح وہ اپنی تماش بینی پر کھل کر فخر بھی نہ کر سکتے تھے۔ نہ بید الٹی میر شکار تھے جو ہر گھڑی فصیح

تقریروں پر دھیان دھرتے اور محاورے حفظ کرتے۔ اسی لیے رنگین جو اس زندگی میں رچ کر سمو کر تحت الثریٰ میں پہنچے، ان سے زیادہ کامیاب رہے۔ انشاء کے یہاں نہ آمد ہے نہ بیساختہ پھکڑپن۔ بڑھاپے میں تو یہ دلالی کرنی پڑی، تمام صفات حسنہ کا جوہر جب پیروں تلے مسلا جا چکا، تب روزی قائم رکھنے کے لیے اس رنگ میں اپنے کو رنگا۔ اسی لیے جو کچھ کہا بقول رنگین

مُنہ چڑھاتا ہے موا انشا جیا کس واسطے ہو کر رہ گیا۔

رنگین و انشاء دونوں کے یہاں مجھے چند مصرعہ بھی ایسے نہ مل سکے جو شریف عورتوں کے جذبات و حسیات کے ترجمان ہوں اور جن سے گھریلو سکون و پاکیزگی ٹپکتی ہو

ریختی کو ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں، یہ بات ذرا سوچنے کی ہے۔ وہ فحاشی کی ایک قسم ضرور ہے اور ایک فرقہ کی زبان بھی ہے، عامیانہ تک بندی بھی ہے اور بازاری ماحول و زندگی کی عکاس بھی ہے۔ ملک کی قوم کی اور انسان کی پستی کا اندازہ بھی اس سے کیا جا سکتا ہے مگر اسے شعر نہیں کہہ سکتے۔ وہ موزوں کلام جو صرف ظاہری اعضائے جسم کو متاثر کر سکے شعر کیسے بن سکتا ہے؟ وہ شعر جو تصور کو محدود کر دے، داخلی و اندرونی کیفیات کا اظہار نہ کر سکے، انسان کی حسِ لطیف اثر انداز نہ ہو، جس کے ذریعہ جوہر انسانیت کو اجاگر نہ کیا جا سکے اور جو عشق و محبت کے لطیف ترین جذبات کا متحمل نہ ہو سکے، جہاں نغمہ ہو نہ ترنم، اک جمود مسلسل کو شعر کہنا بھی غلط ہے جس ادب کے ذریعے سماج کو پاکیزگی و خلوص نہ مل سکے اور جو ہمیشہ زندگی کی ناؤ شہر کے گندے نالوں ہی میں کھیتا رہے وہ صحت مند سماج کے لیے کس حد تک قابل اعتنا رہے۔ اس کا فیصلہ کرنا ہو گا۔ اس میں شک نہیں اس وقت کے بیمار ماحول، مریض سوسائٹی اور مدقوق فضا میں پرواز کرنے والے تخیل سے ہم کسی صحت مند ادب کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ مگر پھر بھی اتنی بڑی دنیہ

پڑی تھی۔ زندگی کے عنوان گلی گلی بکھرے ہوئے تھے۔ ملک اچھا خاصا جھولا ہو رہا تھا شعراء جتنی بڑی پینگ دل چاہتا بڑھا لیتے۔ رنگا رنگ بزم آرائیاں بھی تھیں اور آپ بیتی جگ بیتی کہانیاں بھی۔ میدان کارزار بھی موجود تھا اور خلوت گہہ ناز بھی۔ مگر خدا بزدلی اور تنگ دامانی کا بھلا کرے' داستان حیات' شب عروسی سے لے کر زچہ خانہ ہی پر تمام ہو گئی نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی' ددّا کی اوڑھنی تلے۔ ریختی گویوں میں جان صاحب کسی قدر وسیع النظر واقع ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں کہیں کہیں شعریت بھی ہے اور تنگ دائرہ کو توڑ کر انہوں نے آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جان صاحب نے محاورے اور ضرب الامثال بڑی چابک دستی کے ساتھ استعمال کی ہیں۔ کسی جگہ انداز بیان میں ستھرائی اور لطافت بھی پیدا ہو گئی ہے اور دو چار جگہ گھریلو رنگ زار چوکھا ہو گیا ہے۔ مگر جہاں تک گندگی اور بیہودگی کا سوال ہے وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے طوائف الملوکی کا اتنا گہرا اثر سوسائٹی پر پڑا تھا کہ پوری سوسائٹی طوائف بن کر رہ گئی تھی اور اگر ریختی اس زمانہ کی سوسائٹی اور ماحول کی آئینہ دار ہے تو یقیناً ہمیں بے تکلف چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ ایسی بات بھلا زبان سے کہنے کی ہوتی ہے بازار میں ناک کیوں کٹائی جائے۔

ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

بہرحال انشا کی ریختی نہ شعر ہے نہ ادب۔ وہ تو بس زبان حال سے کہہ رہی ہے ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اگرچہ وہ اس پر اڑے رہے کہ ریختی گوئی میں نام پیدا کر کے رہیں گے۔ خود کہتے ہیں ؎

ہمت کبھی نہ ہار لیے انشا یہ چاہیے
جو بات دل میں ٹھنی ہے ٹھنی رہے

مگر ریختی کی ایک قسم اور بھی ہے جس کو آپ ہندی شاعری کی نقل کہہ سکتے ہیں۔ اس میں عورت کی زبان میں وہ سب کچھ کہا گیا ہے جو غزل قصیدہ نعت و منقبت میں کہا جاتا اور یہ صنف شاید اس زمانے کی پیداوار ہے جب فارسی شدت کے ساتھ سنسکرت' برج بھاشا وغیرہ سے متاثر ہو رہی تھی اور اس وقت اس کو ہندی یا ہندوی کہا جاتا تھا مثلاً امیر خسرو کہتے ہیں :-

سکھی پیا کوں کہو نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں یہ کاری رتیاں

اسی طرح دکنی شعراء کی ریختی ہے جو سرتاسر ہندی کے اثر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ خواجہ گیسو دراز "کا چکی نامہ"، شاہ کمالؒ کرڑیوں کے گیت، حمد لغت، تصوف، روحانیت اور معرفت سب کچھ تو اس میں ہے لیکن اس صنف سخن کا نام اس وقت کیا تھا۔ مجھے اس میں شبہ ہے کہ اس کا نام اس وقت ریختی تھا۔ ان دنوں اس کو ہندی شاعری کہتے تھے۔

اردو ادب نے مارچ ۵۸ء میں ایک مضمون محمد سخاوت مرزا کا ہاشمی بیجاپوری ریختی گو پر شائع کیا ہے۔ ہاشمی کے یہاں بھی مجھے وہی ابتذال نظر آیا۔ جو لکھنوی ریختی میں ہے۔ اس میں شک نہیں ہاشمی دکن کا تھا۔ وہاں زیادہ سردی ہوتی ہے نہ گرمی۔ اس لیے اس کی ریختی میں بھی شمالی ہند کے مقابلہ میں اعتدال ہے مثلاً ہاشمی کہتا ہے ؎

اے بلبل چنچل سن ہلکانی چال چل توں
جلدی سنی چلن میں بجتے ہیں زور گھنگرو
گھونگھٹ لٹکا فریبی نت

جان صاحب — جان سولی پہ رہے گی مری بھیا منصور
بد نظر وہ ہیں نہ رکھوں گی طرحدار اصیل

نازنین — ہوئی عشاق میں مشہور ریوسف سا جواں تا کا
بُوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا
اے دوگانا جان دیکھیں کس کی مہندی خوب ہو
سرخ ہوتے ہیں ہمارے یا تمہارے ہاتھ پاؤں

ہندی شاعری میں عشق و محبت کا اظہار عورت کی زبان سے ہوتا ہے اور دکنی اردو کیونکہ اس سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ اس لیے وہاں ہندوستانی عورت کے جذبات کی عکاسی نسبتاً لکھنؤ کے ریختی گویوں کے مقابلہ میں کسی قدر پاکیزگی و ستھرائی کے ساتھ کی گئی ہے۔ لیکن ہاشمی نے زنانہ لباس پہن کر اس بھرم کو بھی کھو دیا تھا۔

سرشار اور ان کے ناول

"ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" والی مثل تو سیکڑوں بار سنی تھی مگر اس کا صحیح مفہوم یقین مانیے "فسانہ آزاد" پڑھ کر سمجھ میں آیا۔

واقعہ یہ ہے کہ سرشار نے سلطنت اودھ کے ملبہ سے زور لگا کر سر ابھارا اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ تو قیامت آچکی تھی۔ سورج مشرق سے طلوع ہو رہا تھا۔ اور اس کی آڑی ترچھی کرنیں ریاست اور جاگیرداری کے کھنڈروں اور زمین بوس ہوتی ہوئی عمارتوں پر پڑ رہی تھیں۔ اسی بکھرتے ہوئے تانے بانے کی نزاکت پر مشرق و مغرب کا ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ حضرت اکبر نے بھی اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

بجنے لگا پیانو چپ ہو گیا چکارا
بے تاب ہو کے آخر یہ شیخ نے پکارا
دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدا را
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

اس وقت ہندوستان کی چھاتی پر مشینی ڈرمٹ[1] چلنا شروع ہو چکے تھے۔ فضا میں ریلوں کی شور اور انجن کی سیٹیوں سے ارتعاش پیدا تھا۔ مشروع[2] کے

[1] ڈرمٹ سڑک کوٹنے کا لکڑی کا ایک اوزار [2] ایک کپڑا جو پہلے پاجامہ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

پاجامہ اور اور تین کمر توئی والے انگرکھے جلدی جلدی بکسوں میں بند ہو رہے تھے اور سونا چاندی ہانڈی مٹکے سے نکل کر بینک میں پہونچنے لگا تھا۔

اس "نیمے دروں نیمے بروں" ماحول میں سرشار نے آنکھ کھولی۔ تو کیا دیکھا کہ بیمار سوسائٹی کے لا علاج مریض زندگی کے دن پورے کر رہے ہے۔ ماضی کی شان و شوکت۔ حال کے احساس کمتری۔ اپنی خامیاں اور غیروں کی چیرہ دستیاں دیکھ کر بے اختیار انکا جی چاہا کہ ان بکھرے ہوئے نقوش کو اپنی فنکاری کے ذریعہ لافانی بنا دیں۔

چابک دست مصور نے اس مٹتی ہوئی تہذیب۔ بکھرتی ہوئی سوسائٹی۔ اور ان فنا ہوتی ہوئی شکلوں کو تیز۔ شوخ اور خوبصورت رنگوں سے مزین کر کے۔ دائمی زندگی عطا کر دی۔

اچھا ہی ہوا۔ جو سرشار کے دل میں یہ خیال آگیا۔ ورنہ ان بچارے آثار قدیمہ والوں کو موہن جو ڈارو اور ہڑپا کی طرح اودھ کے کھنڈروں میں بھی ہڈیاں سکّے اور ٹوٹے برتنوں کے ٹکڑے سمیٹ کر زنجیر کی ٹوٹی کڑیاں جوڑنی پڑتیں اور تب بھی وہ صرف قیاس آرائی ہوتی۔ یہ آنکھوں دیکھا حال کون سناتا۔

سب سے بڑا احسان سرشار کا اردو ادب پر یہ ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ بغیر جادو ٹونے اور پیر و فقیر کی مدد کے بغیر پلاٹ۔ ترتیب اور تکنیک کے اتنے بڑے بڑے ناول اور کہانیوں کے مجموعے لکھ ڈالے اور کچھ ایسے عجیب کردار بھی تخلیق کر دیئے۔ جو ہر زمانہ میں چولا بدل بدل کر آتے رہتے ہیں۔

جہاں تک عشق بازی کا تعلق ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ عشق و عاشقی کے طور طریقہ اور رسم ہر زمانہ میں جداگانہ اور مختلف رہے ہیں۔ شیخ سعدی کہتے ہیں

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

یعنی دمشق میں ایک بار ایسا قحط پڑا کہ یار لوگ جوتیاں اور عشق دونوں چھوڑ بھاگ کھڑے ہوئے اسی طرح ایک چنگیز خانی عشق بھی ہوا کرتا تھا۔ اس میں دادا اور پوتے نے مل کر محبوبہ کو پہاڑی سے نیچے پٹک دیا۔ کہ چلو "خس کم جہاں پاک" نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

ویسے ہندوستان ہمیشہ سے مفکروں اور دانشمندوں کا دیس رہا ہے۔ یہاں ایک نظریہ یہ بھی ہے۔

"کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا"

اور غالب نے اپنے ایک خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ مغل بچے عشق میں خود نہیں مرتے تھے۔ بلکہ محبوبہ کو مار رکھتے تھے۔

البتہ اقبال عشق کی شہزوری اور عظمت کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

"عشق بدوش می کشد دامن کوہسار را"

سب سے زوردار اور "بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق" بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے۔ اس میں تخت و تاج تک معشوق کے قدموں پر نچھاور ہو جاتے تھے۔ وہ اب بھی ہوتے ہیں۔

"ہر ملکے و ہر رسمے" لیکن سرشار کے زمانہ میں عاشق نری عاشقی ہی نہ تھی۔ دل بہلاؤ کا مشغلہ اور امیری کا چوچلا بھی تھی۔ بلکہ حکومت، سوسائٹی اور ادب پر دھونس جمانے کا ہتھیار بھی تھی۔

فسانۂ آزاد پڑھ کر تو یہ گمان ہوتا ہے کہ افسانہ کے ہیرو میاں آزاد تو اسی کی روٹی کھاتے تھے اور اسی کے سہارے جیتے تھے۔ اسی عشق بازی کی بدولت جس راستے نکل جاتے۔ "ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا است" کا نقشہ جم جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ریل اور جہاز پر سفر تک عشق کے بل بوتے پر کیا کرتے تھے۔

کہتے ہیں جن دنوں سرشار نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھانی شروع کیں ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی تھی۔ اور لوگوں کو بے تابی کے ساتھ ان کے مسلسل ناولوں کی قسط در قسط کا انتظار رہتا تھا۔ یقیناً یہی حال ہوگا۔

کیوں کہ ۱۹۲۲ء میں جب ایک بزرگ کی عنایت سے ہم لوگوں کو فسانہ آزاد کی چاروں جلدیں ملیں تو مجھے یاد ہے۔ مہینوں اس کے پڑھنے۔ سننے اور اس پر بحث و مباحثہ کرنے کا سلسلہ ہم نے جاری رکھا۔ تحریر میں ان کی نقل ہم نے شروع کی۔ محاورے اس سے سیکھے۔ اشعار یاد کرنے کا شوق بڑھا ظرافت، وخوش طبعی اور پھکڑپن کے درمیان تفریق وتمیز کا سلیقہ ہمیں اس سے حاصل ہوا۔ اور اتنی لگن سے اور اس محنت سے ہم سب نے اسے پڑھا کہ پڑھتے پڑھتے ایک ایک ورق بکھر گیا۔

مگر دماغ میں چند اہم کردار ایسے محفوظ ہو گئے کہ آج برسوں گزر جانے کے بعد بھی جب سوچو۔ اتنے ہی جوان، شوخ۔ اور زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں۔

کہتے ہیں۔ آرٹسٹ اپنے آرٹ میں خود جھلکتا ہے۔ سرشار کے ناول بھی ایک ایسا ہی آئینہ ہیں جس میں وہ خود مع اپنی شخصیت، اپنی سماج اور اس کی رنگ رلیوں کے جلوہ فگن ہیں۔ سوسائٹی کا ہر فرد اپنے مشاغل اور سرگرمیوں میں تن من دھن سے لگا ہوا ہے۔

محبت کی فراوانی ہے۔ حسن گلی کوچوں میں بکھرا پڑا ہے اور منچلے نوجوان جھروکوں اور بالا خانوں کے نیچے منڈلا رہے ہیں کہ شاید کوئی ناظورۂ ملائک فریب نظر آجائے۔ اور وہ ہائے کا نعرہ مار کر بیچ سڑک پر دھڑام سے گر کر بیہوش ہو جائیں۔ یہ کوئی عیب میں شمار نہ تھا کہ راہ چلتے اللہ کے بندے آکر مریض عشق کو اٹھائیں اور بار دوست مہریوں کٹنیوں اور مشاطاؤں کے ذریعہ دنیا میں روزن پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اتنا ہی نہیں پردہ نشینان حرم چلمن کی آڑ سے محبت والفت کی باتیں کرنے

کے علاوہ زانو پر سر رکھ کر لٹا بھی لیتی تھیں۔ بلکہ سہیلیوں کو بلا بلا کر اپنے شکار کو فخریہ دکھاتی بھی تھیں۔ اور ان سادہ لوح عشاق کی جوانامرگی پر آنسو بھی بہاتی تھیں۔

خوب خوب شعر خوانی ہوتی۔ رقعہ بازیاں ہوتیں مزے مزے سے کوٹھے پر آنکھیں اور پتنگیں لڑاتی جاتیں منظوم سوال جواب ہوتے۔ مگر گھر اور محلہ والوں کے کان پھوٹے ہی رہتے۔ اور کوشش یہی رہتی۔ کہ

بازار میں ناک کٹے اور گھر والا کوئی نہ جانے

"فسانۂ آزاد" کے ہیرو میاں آزاد کشمیری شزادے ہیں۔ ہر فن مولا ہیں۔ شراب نظر بازی۔ دلالی۔ دھوکہ۔ فریب سارے چٹے بٹے ان کی ہتھیلی میں بھرے ہیں۔ ساتھ ہی عالم بے دل۔ شاعر غراّ اور تمام علوم جدیدہ سے واقف ہیں لیکن جب انجمن حسن میں انٹرویو کے لیے پیش ہوتے ہیں۔ تو صرف "پیرنا بالغ" کے عقد کی تاریخ کہہ دینے سے کامیابی کا سرٹیفکٹ مل جاتا ہے۔

میاں آزاد آپ کو ہر جگہ ملیں گے۔ وہ کبھی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے نظر آتے ہیں۔ اور کبھی سوٹڈ بوٹڈ کسی سرائے میں کھٹیا[1] پر پڑے ہوئے بی بھٹیاری سے مخول کرتے ملتے ہیں۔ کبھی شریف و مہذب النسان کی شکل میں بیگم صاحبہ کے محل میں بیٹھے ہیں تو کبھی گوالیار کے بانکے بنے ہوئے کسی نواب کی محفل میں شریک ہیں۔ ترکی کا میدان جنگ ہو یا ہندوستان کی محفل عیش۔ نظر بازی کے مواقع بھی ان کو ہر جگہ فراہم ہو جاتے ہیں۔ ایک بار میدان کارزار میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آگیا۔

اور اس وقت

تمہاری تیغ کا منہ چڑھ کے لے لیا بوسہ
کسی سے دب کے نہ ہم بانکپن میں رہے

---

[1] پلنگ۔

حد ہوگئی۔ تلواروں کی چھاؤں میں جان پر کھیل کر قاتل کی گردن میں لٹک گئے۔ اور خوش قسمتی دیکھیے کہ قاتل صنف نازک سے تعلق رکھتا تھا اور جب اس جرم کی سزا بھگتنے سائبیریا بھیجے گئے تو حضرت عشق نے وہاں بھی دن عید اور رات شب برات کا سامان مہیا کر دیا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ سرشار نے ایسے طوفانی ہیرو کے لیے اتنی نستعلیق ہیروئن کیوں منتخب کی۔ حسن آرا بیگم جو کتاب کی جان ہیں۔ اتنی پھیکی۔ سنجیدہ اور کبھی کبھی سی ہستی ہیں۔ کہ بعض وقت طبیعت بور ہو جاتی ہے۔ ان کا سنجیدہ اور بزرگانہ انداز اور زمانہ ساز ادائیں دیکھ کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ان پر عاشق ہونے کی میاں آزاد کی ہمت کیسے پڑی۔ اور اتنے مصلحت اندیش حسن نے پذیرائی الفت کیسے کی۔

فسانہ آزاد کے ہیرو اور ہیروئن میاں آزاد اور حسن آرا دونوں اتنے سطحی اور غیر فطری کیوں ہیں۔ اس پر غور کرنے سے پہلے ہمیں پس منظر پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرشار کی نگاہوں میں پرانا بادشاہی ٹھاٹھ گھوم رہا تھا۔ غیر ملکی حکومت کے بوجھ سے کچھ کندھے بھی ٹوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہم وطنوں کی پست حالی اور جہالت پر بھی رہ رہ کر جی کڑھتا ہوگا۔ اور شاید اسی لیے وہ ایسا مجموعۂ اضداد کیریکٹر تلاش کر لائے۔ جس سے کبھی مذہب سائنس یا ہیئت پر تقریر کرا دیتے ہیں اور کبھی اسے محفل شعر و ادب میں بٹھا دیتے ہیں۔

میں سوچا کرتی تھی۔ کہ ہیرو اور ہیروئن تو بھولے بسرے ہو گئے اور اللہ رکھی چلبلی دلکش تخیل میں کیوں موجود ہے۔ کتاب کے دوسرے کیریکٹر تو دھندلے ہو کر حافظہ سے محو ہو گئے۔ مگر سلارو۔ خوجی اور صف شکن بٹیر والے نوابصاحب بدستور موجود ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔

اتنے برس بعد اب پھر دیکھا تو محسوس ہوا کہ دراصل ہیروئن کا کردار سرشار پوری طرح نبھا نہ پائے کیوں کہ ہندو مسلمان دونوں شریف زادیاں پردہ

نشین اور حیادار ہوا کرتی تھیں۔ ان کے کیریکٹر میں شوخ رنگ بھرنا سرشار کی قدامت پسندی نے گوارا نہ کیا۔ ناول کا ہر کردار الگ انفرادیت کا حامل ہے۔ عباسی مہری اپنی جگہ خاصے کی چیز ہے۔ نواب ممتاز اور خورشید بنے بنائے ٹیپکل نواب زادہ ہیں۔ اور بڑی بیگم صاحبہ توہم پرستی اور آزاد خیال کی عجیب و غریب مجموعہ ہیں۔ کچھ کیریکٹر اتنے بھولے اور ان کا حافظہ اس حد تک خراب ہے کہ دھوکے میں دوبارہ شادی تک کروا لیتے ہیں۔

بس غضب کا کیریکٹر بی اللہ رکھی کا ہے۔ "سب گنوں پوری کوئی نہ کہو لنڈوری" پاکدامنی کا یہ عالم "دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"۔

اور آوارگی کا یہ حال کہ چھم چھم کرتی ہوئی محفلوں گلیوں اور سرائے میں گھوم رہی ہیں۔ جس نے چاہا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لے گیا۔ اور جب موقع مل گیا۔ دامن چھڑا کر بھاگ نکلیں۔ ہر سمت قتل عام کرتی پھر رہی ہیں۔ اور مصنف بچارے کا یہ حال ہے کہ قدم قدم پر ان کی عصمت و عفت کی قسمیں کھا رہا ہے۔

ایک دوسرا بڑے دھڑلے کا کیریکٹر یولینڈ کی نواب زادی صاحبہ کا ہے جو ایک خطۂ زمردیں میں زیر دامن کوہ رنگ محل سجائے گوہر جان بنی ہوئی شکار کھیل رہی ہیں اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کا بول بالا کر رہی ہیں۔ سرشار کی وطن پرستی بھی اپنی مثال نہیں رکھتی۔ بقول شاعر

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

بمبئی ہے تو لکھنؤ قسطنطنیہ ہے تو لکھنؤ میدان جنگ ہے تو اس پر بھی لکھنؤ کا رنگ چھایا ہوا ہے اور دریائے ڈینیوب کے اس پار بھی لکھنؤ آباد ہے۔ مصنف کے منہ سے لگا ہوا کافر لکھنؤ چھٹ ہی نہ سکا۔ ایسا لگتا ہے۔ سرشار کے بھی فاؤسٹ

کی طرح دو روحیں تھیں۔ اور ان دونوں میں ہر گھڑی جو تی پیزار ہوتی رہتی تھی اسی کشمکش کی بدولت وہ خود زندگی بھر توبہ پہ توبہ اور پے درپے توبہ شکنی کرتے رہے۔ اور اپنے ہیرو میاں آزاد خانہ برباد سے بھی کتراتے رہے۔ جب مرضی ہوئی ان سے شراب خانہ خراب کے خلاف دھواں دھار تقریر کرادی اور ہر بار بقول حسرتؔ۔

برسات کے آتے ہی توبہ نہ رہی باقی
بادل جو نظر آئے بدلی میری نیّت بھی

فسانہ آزاد کے دو اور کردار۔ مولانا اور استانی جی بھی ہیں اور دونوں بالکل گڑیا گڈّے نظر آتے ہیں۔ زیادہ مٹی پلید استانی جی کی ہے۔ اکبار گی آن دھمکتی ہیں۔ اور ایک پھیکی بے موقع تقریر کر دیتی ہیں۔ پر لطف کی بات یہ ہے کہ ان کو جانتے سب ہیں مگر پہچانتا کوئی نہیں ہے۔ سرشار نے فسانہ آزاد کے علاوہ۔ جام سرشار۔ سیر کہسار ہشّو۔ پی کہاں وغیرہ اور کئی ناول بھی لکھے ہیں۔ ان ناولوں میں حماقت کی پوٹ رئیس۔ ان کے عقلِ کُل مصاحبین گوالیار کے بانکے۔ لکھنؤ کے شہدے۔ چانڈو خانہ کی گپیں۔ محرم کی مجلسیں اور بازار کا غل غپاڑہ سب کچھ موجود ہے۔ اس میں پیروں کی بے پیری۔ عوام کی اخلاقی پستیاں بیگمات کا توہّم اور حکام کی نا اہلیت سب کا ہو بہو نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

سرشار کے قلم نے لکھنؤ کے کہاروں اور کمہاروں تک کو زندگیِ جاوید بخشدی۔ سیر کہسار اور جام سرشار میں نواب صاحب۔ تُراب علی اور چھمّن کے انداز و اطوار ان کے مکالمے۔ ان کی دلچسپیاں میاں گھسیٹے اور بہت سے دوسرے لوگ اپنے وقتوں کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

ایسا لگتا ہے۔ جیسے کسی عمارت کی لونا لگی ہوئی اینٹیں آہستہ آہستہ کھسک

رہی ہیں۔ اور سرشار بتاتے جارہے ہیں۔ اب یہ ستون گرا۔ اب دروازہ ڈھیر ہوا۔ اب دیوار ڈھے گئی۔ اور پھر چھت بھی بیٹھ گئی۔

ہندوستان کی تاریخ اور ادب پر یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ ناول پڑھ کر یہ افسوسناک انکشاف بھی ہوتا ہے۔ کہ سرشار کو جدید علوم سے بہت دلچسپی تھی۔ مگر زندگی اخبار سے وابستہ ہوگئی۔ شوق تھا ناول نگاری کا اور ماحول وہ ملا جس میں "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" دنیا گھومنے کا شوق اور حالات نے ایسا جکڑ کر رکھدیا۔ کہ ساری حسرتیں مٹی میں مل گئیں۔ ناچار۔ آوارہ گرد شہسوار۔ عاشق و معشوق۔ مولانا۔ چانڈو باز جس کے منہ سے جو چاہا کہلوا دیا۔ زبان پر باڑھ لکھنؤ میں رکھی جاچکی تھی۔ ٹوکریاں بھر بھر کر موتی ساری کتاب میں رول دیئے۔ اور استعارے، محاورے ضرب المثل۔ چٹکلے لطیفے۔ ضلع جگت اور پھبتیاں صفحات کاغذ پر انڈیل دیں۔

عموماً اہل علم و فن ہوں یا شاعر و ادیب عمر کے ساتھ ساتھ اپنے فن میں پختہ تر ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن سرشار اس معاملہ میں بھی منفرد نظر آتے ہیں۔

پیسہ کوڑی کے فضول خرچ تو بہتیرے دیکھے ہیں۔ مگر ایسا سخی داتا نظر سے نہیں گزرا۔ جس نے علم و ذہانت کا خزانہ تک لٹا دیا ہو۔

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

اور سب سے بڑی خوبی تو یہ تھی کہ وہ عناصر کے ظہور ترتیب کے قائل نہ تھے موت سے پہلے ہی انہوں نے ان تمام اجزائے حیات کو منتشر کر دیا تھا جن سے تعبیر حیات ہوتی ہے۔ اپنی انہیں ادبی فضول خرچیوں کی بدولت وہ مفلس و قلاش مرے۔ بھلا خیال تو کیجیے۔ اتنا بڑا ذہین۔ ذی علم ظرافت و خوش طبعی کا بادشاہ جب سارا خزانہ لٹا چکا اور کمال کو زوال ہوا۔ تو اس نے "ہشّو۔ کڑم دھم۔ اور پی کہاں کی پھانسی لگا کر جیتے جی خودکشی کر لی۔" حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔"

لہ سہ سہ آزاد کے آخر زمانہ میں لکھے ہوئے بازاری ناول۔

نظیر پر ایک نظرے خوش گذرے

دامان نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گلچین بہار توزداماں گلہ دارد

نظیر جیسے رند مشرب اور وسیع النظر شاعر کے ساتھ جتنی تنگ نظری و کوتاہ قلمی آج تک برتی گئی ہے اس کی تھوڑی سی تلافی تو ۱۹۶۸ء میں نگار لکھنؤ کے نظیر نمبر نے کر دی تھی اور پڑھے لکھے طبقے کو ایک ایسے شاعر سے روشناس کرا دیا تھا جو صرف، فقیروں، اکہ تانگہ والوں اور نوٹنکی کے نقلچیوں ہی کا نہیں، عوام کے دکھ درد کا ترجمان، اور ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا اور اس وقت پہلی بار ہم سب کو نظیر کی ہمہ گیری اور اہمیت کا احساس ہوا تھا۔

اقبال نے حیات قلندرانہ کا ایک شاندار تصور اردو ادب کو تفویض کیا ہے۔ لیکن اس سے بہت پہلے نظیر نے بھی قلندرانہ زندگی کا ایک انوکھا انداز اہالیان وطن کو سکھایا تھا۔ اور ان کی زندگی بھی سو فیصدی زندگی کہے جانے کی مستحق تھی۔ متانت و سنجیدگی کتنا ہی ناک بھوں سکیڑے مگر۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

بر کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

ایسی زندگی نبھانا اور گزارنا ہر کسی کے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔ زندگی بھی کیسی؟ طوفان بدوش اور تھوڑی بھی نہیں۔ چار کم پوری ایک صدی تک نظیر اس دنیا کی چھاتی پر مونگ دلتے اور دُند مچاتے رہے۔ اس شان سے

"صبح اور بن شام اور ہی بن، آج اور روش، کل اور طرح"

ارادہ تو شاید یہی تھا کہ عاقبت کے بوریے سمیٹ کر رخصت ہوں گے مگر ملک الموت تو سدا کے بدمذاق واقع ہوئے ہیں، نہ موقع دیکھیں نہ وقت جب جی چاہتا ہے آن دھمکتے ہیں۔ آخر نظیر کو بھی باحسرت و یاس یہ کہتے ہوئے جانا ہی پڑا۔

"ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے"

حالانکہ یہ "ٹک دیکھنا" کوئی معمولی نہیں تھا۔ جہاں تک دیکھنے، برتنے لطف اندوز ہونے اور رنگ رلیاں منانے کا سوال ہے۔

"ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں"

ولی دکھنی سے لے کر غالب تک، خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی اٹھارہ بیس شاعروں کی جوانیاں انھوں نے دیکھ ڈالیں اور سب سے بڑھ کر خود اپنی آفت بھری جوانی جو بقول خود۔

"بگولا باد کا یا برق یا آتش کا انگارا"

تھی اور جس میں بیسیوں بار انہوں نے "کبھی فرہاد کو گھیرا کبھی مجنوں کو للکارا"

ابھی تھوڑے روز ہوئے "یوم غالب" میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر کاٹجو نے کہا تھا۔

"اردو شاعری غیر ملکی تشبیہوں اور استعاروں سے بھری پڑی ہے۔

ان بدلے ہوئے حالات میں کیا ہی اچھا ہوتا اگر اردو شاعر اپنے دیس
کے مناظر اور تمثیلوں سے اپنی شاعری کو مزین کرتے۔"

شاید موصوف کی نظر سے ہندوستان کا یہ شاعر نہیں گزرا جو کھرا اور خالص سودیشی تھا۔ اور گزرتا بھی کیسے۔ اب سے ۱۵ سال پہلے تک نظیر کو بھلے آدمیوں کی محفل اور شعراء کی صف میں جگہ ملنے ہی کے لالے تھے۔

بھلا خیال تو کیجیے ایک ایسے دور میں جب سوز۔ میر۔ سودا۔ ذوق، مومن اور غالب جیسے شعرائے نازک خیال، آسمان سے برس رہے ہوں، رونا، جھینکنا، آہ و نالہ، ہجر و فراق اور گل وبلبل کی داستانیں گڑھنا شرفا اور اہل علم کا عام مذاق ہو۔ ادب کی حدود متعین ہو چکی ہوں اور زبان و بیان پر استادوں کی سندیں ڈھونڈھی جاتی ہوں، ان حدود سے انحراف گناہ کبیرہ میں شمار ہوتا ہو، قلعہ معلّٰے کے سخن شناسوں کی محفل میں ان بے تکی تانوں کی کیا خاک شنوائی ہوتی؟ ہولی، دیوالی۔ شب برات کی ہو ہو ہاہا۔ بلدیو جی کا میلہ۔ ریچھ کا بچہ حتّٰی کہ مکھی اور پنکھے تک پر نظم کہہ ڈالنا ٹھیٹھ گنوار پن نہیں تو اور کیا سمجھا جاتا۔

کہاں وہ نفاست مزاجیاں اور کہاں برسات کی پھسلن کا یہ حال، کہ

"آخر کو واں نظیر بھی آکر پھسل پڑا"

ایک طرف تو شعراء کا یہ دستور کہ اپنی روٹی کا ٹھکانہ کرنے کے لیے بھی ہاتھ پیر ہلا کر کفران نعمت کے مرتکب ہونا پسند نہ کریں صرف ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر امرا کی نظرِ کرم کے منتظر بیٹھے رہیں اور کہاں میاں نظیر کے موچی، لبساطی اور سرمہ والا بن کر گلیوں میں چکّے پھیریاں اور بازاروں میں ہو حق۔

متانت و شرافت کے اس خود ساختہ دور میں جب شاعر عوام کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کیا "وبائے عام" میں مرنا بھی پسند نہ کرتے ہوں، نظیر بیچ بازار

میں ہولی کھیلتے نظر آتے ہیں خود کہتے ہیں ؎

"کسی کا بھر گیا جامہ کسی کی پگڑی بھری
کسی کے منہ پہ لگائی گلال کی مٹھی

اتنے ہی پر بس نہیں، اپنا بھی یہ حال ہے ؎

بھگویا دیروں نے جب نظیر اپنے کو ہولی ہیں
تو کیا کیا تالیوں کا غل ہوا اور شور قہ قہ کا

اس رنگین زمانہ میں ہر شریف زادہ کسی نہ کسی پر عاشق ضرور ہوتا تھا اور معشوق تک نامہ و پیام پہنچانے کے لیے اللہ کی دی ہوئی مہریاں، کٹنیاں۔ کبوتر۔ قاصد۔ نامہ بر سب ہی موجود تھے۔ لیکن میاں نظیر کو تو ہر اس بات سے چڑھ تھی جو شریفوں کا شیوہ ہو۔ انہوں نے عشق بازی کا نیا ڈھنگ نکالا اور منہار لبساطی مداری یا سپیرا بن کر دربار تک پہنچے۔ کہتے ہیں۔

سو مکر و فن بنانا سو رنگ و روپ بھرنا
عاشق کو سب طرح سے خوباں کی دید کرنا

اور جب اس بہروپیے پن سے کام نہ چلا تو کوٹھے اٹاریاں پھاند گئے۔ دیواریں تڑق گئے۔ یہ آوارہ گردی اور پھکڑ بازی اگر اس وقت کے متین و ثقہ لوگوں کو پسند نہیں آئی تو اس پر اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟ وہ زمانہ ہی ایسا تھا ہم سب تو ایسے دور میں سانس لے رہے ہیں جس میں اخلاقی قیود و قوانین کی دھجیاں اڑ رہی ہیں۔ آج کا قانون تو صرف یہ ہے کہ کوئی قانون ہی نہ رہے لیکن نظیر تو اپنی سماج کے مضبوط بندھنوں کو توڑ کر باہر نکلے تھے۔ ایک دو کڑیاں ٹوٹتی ہیں تو غل مچ جاتا ہے نہ کہ زنجیر کی ساری کڑیاں توڑ کر بکھیر دی جائیں۔ ظاہر ہے تہلکہ تو مچنا ہی تھا۔ زندگی پہ گہری نظر ڈالنے والے صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔ لیکن زندگی کے

ہر پہلو کا عملی تجربہ حاصل کرنے والے تو شاید ہزاروں سال میں زمین سے اُگتے ہوں گے۔ میں نے اُگنے کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیوں کہ میاں نظیر اس سماج اور اس سوسائٹی کی پیداوار تھے جس کی ہر اچھی بری چیز کو انہوں نے اپنایا، انھوں نے خیالی گھوڑے نہیں دوڑائے ہیں۔ بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھ کر شعر نہیں کہے۔ عوام میں گھل مل کر آندھی میں اولوں کی بوچھار میں، ٹوٹے چھپر میں، ٹپکتے مکان میں موری اور پرنالہ میں گھس کر شعر کہے ہیں۔

خیال و تصور کے رسیا اور باتوں کے دھنی پھول چنتے ہیں مگر کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہیں۔ لیکن نظیر اندھیری گلیوں، کچے مکانوں، چمکتی ہوئی بجلی، بجھتے ہوئے دیئے، چھپر کے پرانے پن، آدمی ریچھ اور گلہری کے بچے، سورج، چاند اور ستارے، سب پر یکساں عاشق ہے۔ غالب اپنی معشوقہ کی بدتمیزیوں کا سارا الزام اپنے سر لیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

لیکن نظیر بڑی سچائی کے ساتھ اپنی محبوبہ کی گنوار و حرکتیں گنواتے ہیں۔

"کہنی مارے، چٹکی لے کے چھیڑے، جھڑکے، دیوے گالی"

وہ کیوں چھپائیں معشوق معشوق ہے۔ چاہے دیہاتی ہو یا شہری۔ اگر اس کی مہذب ادائیں پیاری لگتی ہیں تو دیہاتی ناز نخرے کیوں برے معلوم ہوں؟

وہ اپنی معشوقہ کی مانگ ثریا اور کہکشاں سے کبھی نہیں سنوارتے نہ چاند ستارے اس پر جڑتے ہیں۔ سیدھی طرح اس دنیا کی بات کرتے ہیں۔

"زلفوں کی کھلت پٹی کی جمت چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہی" جیسی اس دنیا میں ہوتی ہے۔ بس ذرا اس سے اچھی زیادہ لگتی ہے حتیٰ کہ چیچک کے داغ بھی ان

کے عشق میں کبھی حارج نہیں ہوئے

یہ نقش نہیں چیچک کے منہ پر عرق آلودہ

یا حسن کی صافی سے قطرے کئی چھن نکلے

کبھی کبھی مبالغہ پر اتر آتے ہیں تو اس طرح تعریف کرتے ہیں۔

اک پھول اٹھا لے تو مُڑک جائے کلائی

دنیا جہاں کے شعرا رقیبان روسیاہ کا تذکرہ کرتے آئے ہیں مگر یہ مصوّری تو نظیر ہی کا خاصہ تھی ذرا جولانی طبع تو دیکھیے ؎

بھاگا رقیب ہار کے ہاتھوں پہ ہاتھ مار کے

کچھ نہ بنا تو دی اذان کوٹھے پہ جا کے یار کے

صبح کے ڈر سے ہڑبڑا کے یار نے گھر کی راہ لی

ہم بھی دغا میں آ گئے مفت بہار لٹ گئی

میاں نظیر نے محاورے بکثرت نظم کیے ہیں کلیات میں بہت سی کہاوتیں مثلیں اور محاورے منظوم ہیں جو معلوم نہیں اب سے دو سو سال پہلے مروج تھے یا نظیر کی انوکھی طبیعت نے وضع کیے ہیں اور پھر عوام کی زبان پر چڑھ گئے۔ مثلاً

پکائی کھیر تھی قسمت سے ہو گیا - دلیا

یا

چل بے زیادہ اب نہ بک تو نے تو سر پھرا دیا

اور　　خدا کے واسطے اتنا تو جھوٹ مت بولو

کہیں نہ ٹوٹ پڑے آسمان کوٹھے پر

یا

کہ جیسے ٹوٹ کر میووں کے ہوویں ڈھیر آندھی میں

ایک جگہ کہتے ہیں "وہ خود ہی آملا جب وقت آیا آن ملنے کا۔"
معشوق کے غصّے کو شاعروں نے کیا بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ لیکن نظیر نے صرف یہ فطری انداز بتایا ہے۔

"غصّے میں منہ جب اس کا ہم لال دیکھتے ہیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ اب سے چالیس سال ادھر تک تو نظیر عوام ہی کے مقبول ترین شاعر تھے۔ خواص نے ان کو اچھوت بنا کر محفل سے نکال دیا تھا اور بزرگوں کی ہم سب کو سخت تاکید تھی کہ نظیر کا نہ کوئی شعر یاد کریں نہ کبھی اسے پڑھنے کی کوشش کریں۔

نظیر کا اصلی رنگ کیا تھا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ دیوان اور کلیات تو بس بھان متی کا پٹارہ ہے۔ ایک ورق لوٹو تو اللہ کی قدرت نظر آتی ہے۔ دوسرا دیکھو تو فقر، توحید اور فلاسفی سے لبریز ہے اور آگے بڑھو تو رسالت، شفاعت، منقبت اور تصوف و معرفت کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔ قدیم طرز غزل گوئی سے انحراف بھی مگر غزل پوری غزل ہے اور حسن و عشق کی دنیا بھی آباد نظر آتی ہے۔ معاملہ بندی پہ اتر آتے ہیں تو لکھنؤ کے شہدوں کو مات کر دیتے ہیں۔ اس پٹارے میں بندر بھی بند ہے، ریچھ بھی، سونٹا لیے ہوئے فقیر بھی ہے اور بھبوت ملے دھونی رمائے جوگی بھی موجود ہے۔ اچھا بھلا آدمی بھی اس میں ہے اور آٹے دال کے ساتھ چوہوں کا اچار بھی۔ ساتھ ہی گرو نانک بابا، ورحضرت سلیم چشتیؒ بھی براجمان ہیں۔

معشوقہ، طرح دار بھی نوک پلک سے آراستہ ہے اور بانکی سمدھن بھی اپنی چھب دکھا رہی ہے۔ اپنا بڑھاپا بھی ہے اور بڑھیا محبوبہ بھی جوانی کا ماتم کرتی نظر آتی ہے۔ زبان سے کوئی قلنچی، نہ کوئی اور ہے نہ چھوڑ۔ پنجابی، اردو، فارسی، ہندی،

برج بھاشا، عربی اور پھر ایجاد بندہ بھی۔
کبھی کہتے ہیں ؎

پڑے ہے جیسے جھڑیاں باندھ کر اولوں کا بوچھارا

کبھی فرماتے ہیں۔

ہم وہ میاں ہیں اللہ پالا نہ ڈالے ہم سے
رہتے ہیں ہاتھ باندھے اب حسن والے ہم سے

اپنی پنجابی معشوقہ پر زبان دانی کی دھونس یوں جماتے ہیں۔

جو ٹڑ ہیتھ ہم نے کہا حال ساڈے دل دا
تُسی سب جاندی ہو جی اُسا کی عرج کران

ویسے کوئی انہونی بات نظیر نے نہیں کہی ہے لیکن واقعہ یہ ہے ایسی باتیں بہتیری کہی ہیں جن سے عام طور پر پڑھے لکھے طبقہ کو سابقہ نہیں پڑتا اور اسی لیے یہ اوٹ پٹانگ باتیں سن کر ذرا کان کھڑے ہوتے ہیں۔ اکثر سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔

نظیر کی مالی حالت کبھی اچھی نہیں رہی۔ بڑی مشکل سے سفید پوشی کا بھرم قائم رکھتے تھے۔ لڑکے پڑھاتے تھے اور ان میں زیادہ تر غریبوں کے ہوتے تھے۔ اپنی ایک نظم "مفلسی" میں کہتے ہیں۔

وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

درس و تدریس کا مشغلہ کسب معاش کے لیے تھا اور غزل خوانی امرا اور سخن فہموں کے لیے۔ اہل علم کا مجمع ہوا تو کہا ؎

نسیم پھاڑ گئی آکے ہر ورق گل کا

دہقانیوں کا گروہ دیکھا تو پڑھ دیا ؎

لگتا تھا ورنہ چین کا داماد آگرہ

فیشن ایبل معشوقہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

کچھ نازو ادا کچھ مغروری، کچھ شرم وحیا کچھ بانک پنا
اور گاؤں کی اُدمائی چھوکری کی ادا اس طرح دل کو بھا گئی۔
"بنا کے سج دھج، پھرا کے دامن، لگا کے ٹھوکر، ہلا کے بالا"

نظیر عوام میں رچ کر سمو کر ککڑی تربوزا ور رھنگ سے لطف اندوز ہوئے۔ تربوز کے چھلکوں کی ٹوپی خود معشوقہ کے شربہ ہاتھوں سے پہنی۔ کوٹھوں پر راتیں بھی بتائیں، پرائی بہو بیٹیوں کو جھروکے سے جھانکا بھی اور رقیبوں کے لات گھونسے بھی کھائے۔ آندھی آئی تو چھپے چوریاں کیں اور حقیقت کی جستجو میں جوگی بن کر دھونی رمائی۔ کبھی عرس میں حال وقال کی محفل جمائی، لڑائی کا موقعہ ہوا تو دھینگا مشتی سے بھی نہ چوکے، خوشامد کی راہ دیکھی تو

سر جھکا تقصیر بخشا پاؤں پڑ اور ہاتھ جوڑ

پر اتر آئے۔

نظیر ادھار یے وعدہ وعید کے قائل نہ تھے۔ کہا کرتے تھے ؎

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

انہوں نے زندگی میں ہمیشہ نقدا نقد والا معاملہ رکھا۔ اب اسی ادب کو لے لیجیے کیسا مرغ زریں بنا ہوا شاہوں کی محفل میں چہکتا رہتا تھا۔ نظیر نے اسے تختِ امارت سے گھسیٹ کر گلیوں کی کیچڑ اور کلواروں کے کی تلچھٹ میں خوب ہی لتھیڑا اور جب امارت کی ساری بو اور "پدرم سلطان بود" کا غرور ڈھے گیا تو اسے مفلس عوام کے سپرد کر دیا کہ تمہارا بھی اس پر حق ہے۔

اور سرمستی کا خلعت پہنایا! اور یہ سب کچھ دے دلا کر اپنا حصہ بھی رس چوس کر حاصل کر لیا۔

نظیر جیسا خوش قسمت شاعر اور بے نظیر کھلاڑی شاید ہی دوسرا گزرا ہو۔ ادب کی ایک بہت بڑی فیلڈ میں وہ کبڈی کھیلتے رہے۔ اور دنیا کی بساط پر ۹۶ سال تک الفاظ کی شطرنج کھیلے۔

کہتے ہیں میاں نظیر صوفی منش تھے۔ ہوں گے! یہ تو اس ملک کی ریت ہے کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو اسے ولی اللہ مان لیا جاتا ہے جیتے جی کوئی بات نہیں پوچھتا زندگی میں ہر حسن و قبح پر نظر پڑتی ہے اس لیے بے قدری رہتی ہے۔

نظیر آج زندہ ہوتے تو ہم انہیں کس نظر سے دیکھتے؟ کیا ہم انہیں عوامی شاعر مان لیتے؟ کیا ان کی سرگھڑی کی ہو ہا ہمیں اچھی لگتی؟ کیا وہ اب تک ایک بار بھی ترقی پسند ادیبوں کی محفل سے قدامت پرستی کا الزام لگا کر نہ نکالے گئے ہوتے؟ اللہ جانے کیا ہوتا۔ البتہ "جو شیخ جی واں سے بچ کے آتے تو پھر میں ان کو سلام کرتا"

کیا آج بھی اونچے طبقے کے مہذب لوگ ان کو لوفر اور غنڈہ کہہ کر دامن نہ بچاتے؟ کیا عوام اس وقت پہلے سے زیادہ ان کے عاشق اور دلدادہ نہ ہوتے؟ اور کیا ہم جیسی مہذب مائیں ان کو دیکھ کر یہ نہ کہتیں کہ چھیلا یا ہوا سپوت ہے۔ رانڈ کا سانڈ بنا گھومتا ہے۔

لیکن یہ سب جانتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے بھی ان کو شاعر تسلیم کرنے میں کسے عذر ہو سکتا ہے؟ جب تک جیے ڈنکے کی چوٹ پہ شاعر رہے ان کا جادو بڑوں بڑوں کے سر پر چڑھ کر بولا۔ مرنے کے بعد لاکھ تھڑی تھڑی ہوئی مگر شاعری کی مسند سے کوئی ان کو ہٹا نہ سکا۔ یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ وہ شاعر اچھے تھے۔ شاعر پیدا ہوئے تھے اور دشمنوں کو بھی ان کا لوہا ماننا ہی پڑا۔

"آکاش نے مجھے ایک امرت بھیجا ہے اور ایک ایسا پریم کا سندیش دیا ہے جس تک تمہاری رسائی نہیں۔ زبان خواہ اس کے اظہار سے قاصر رہے مگر یہ محبت لازوال رہے گی اور موت کے بعد بھی یہ پریم کا سندیش میرے ساتھ رہے گا۔"

مرزا غالب — گپ شپ

"یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا"

"میرا خیال ہے کہ یہ صرف غالب کا حُسنِ ظن تھا۔ وہ متقی پرہیزگار ہوتے، تب بھی حکیم آغا جان عیش یہی کہتے:۔

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور مشکل پسندی و مہمل گوئی کا خلعتِ ملامت یوں ہی انہیں ملتا رہتا۔ بھلا ان کو قبل از وقت، ایک صدی پہلے ہندوستان میں وارد ہو جانے کی ایسی جلدی کیا پڑ گئی تھی۔ خیر سے اب آئے ہوتے تو ہندوستان کیسا سارا ایشیا بلکہ یورپ تک ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتا۔ اور اپنے دیس والے بھی پلکیں بچھاتے۔ اپنے اشعار کو سخن فہموں اور سخن شناسوں کی زبان ہی پر نہیں، شلوار جامہ اور ریشکا پہنے چغتائی کے آرٹ میں مجسم دیکھتے۔ ان نکیلے سجیلے نقوش، لانبی لانبی شمع جیسی انگلیوں اور کٹار جیسی آنکھوں کو دیکھ کر غالب کیا کہتے؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ خیال تو یہی ہے کہ اس بانکپن اور رنگ و روپ کو دیکھ کر مارے خوشی کے اپنا زانو پیٹ لیتے۔ ویسے مزاج ان کا بڑا تانا شاہی تھا

یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی طبع سلیم پر گراں گزرتا اور گریبان چاک کر بیٹھتے۔

گاندھی جی ٹھیک وقت پر آئے۔ زمانہ ساز گار ملا۔ اس لیے قدیم بزرگان دین کے ذاتی اور انفرادی عدم تشدد کو اس ٹھاٹھ سے ایجاد بندہ بنا کر اجتماعی شکل میں عملاً دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ غالب کی عجلت پسندی نے ایک ایسے دور تنزل میں جنم لے لیا جب پرانی تعمیریں دم توڑ رہی تھیں اور نئی قدریں پرانے نظریوں سے ٹکرا کر سب کچھ توڑ پھوڑ دینے پر آمادہ تھیں۔ اس الٹ پلٹ میں ٹھکانے کی بات کون سنتا۔ اچھے اچھے بھلے مانس ان دنوں زندگی سے فرار کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے اور بڑے بڑے سورما اس فکر میں تھے کہ ذرا خیال و تصور کی جنت میں پناہ مل جائے تو کسی ماہ رو کے آنچل تلے دم لے لیں۔ خود غالب کا یہ حال تھا۔

"دلی اسباب طرب گم کردہ در بند غم ناں شد
زراعت گاہ دہقاں می شود چوں باغ ویراں شد"

اپنی اس خانہ ویرانی کو دور کرنے کے لیے انھوں نے عرفان و حقیقت، سیاست و مذہب سب کا چورا بنایا اور "آلودہ بہ مے" کر کے سب کے جام و سبو بنا ڈالے۔

مرزا غالب کو اپنی فارسی دانی اور فارسی گوئی پر بڑا ناز تھا۔ کہا کرتے تھے۔

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منیٰ است

حالانکہ وہی بے رنگی اس رنگ رنگیلی دنیا کو اتنی پسند آگئی اور ارباب علم و فن نے اسے یہاں تک اچھالا کہ پر جوش عقیدت مند الہام تک کے قائل ہو گئے اور ملک کے ہر رنگ میں اس بے رنگی کی آمیزش ہو گئی۔

بہر حال اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ فارسی ہو یا اردو، غالب نے کہیں بھی خیال و

کو شعر و سخن کا لباس عطا فرمایا ہے اور ان کی مقبولیت کا بڑا سبب یہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کوئی بات بھی کہنا چاہو، کسی موضوع پر بھی گفتگو ہو رہی ہو، کیسا ہی تذکرہ کیوں نہ ہو۔ غالب کا برمحل اور باموقع شعر زبان پر آ ہی جاتا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر ان کی نظر پڑی ہے اور ہر منظر کی انھوں نے عکاسی کی ہے۔ اب اس کو چاہیے "ادب برائے زندگی" کہیے یا "زندگی برائے ادب"۔ ناؤ گاڑی پر یا گاڑی ناؤ پر بات ایک ہی ہے۔ زندگی میں کبھی یہ بھی ہوتا ہے اور وہ بھی۔

ویسے غالب کے کلام کی تو روز ہی بال کی کھال نکالی جایا کرتی ہے اور آجکل تو یہ فیشن سا بن گیا ہے۔ جس نے قلم ہاتھ میں لیا پہلے مرزا غالب پر مقالہ گھسیٹ مارا لیکن "کار دنیا کسے تمام نہ کرد" والا قصہ ہے۔ انکشاف کا دروازہ بند ہونے والا نہیں۔ جب بھی اس جھروکے میں جھانکو "دامانِ باغبان و کفِ گل فروش" نظر آ جاتا ہے۔ اور جب کبھی اس سمندر میں ڈبکی لگاؤ ایک نہ ایک موتی مل ہی جاتا ہے۔ اب یہی لیجیے ذرا سا مصرع ہے

"شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے"

بہ ظاہر معمولی سا عاشقانہ مصرع ہے، سیدھے سادے لفظ ہیں۔ لیکن جو خیال و تصور کے رسیا ہوں اور جن کے پاس قوت و عمل کا فقدان ہو، وہ اس کا شاعرانہ لطف اٹھائیں۔ مگر حرکت و عمل کے شیدائی کو تو ایک جہان معنیٰ اس مصرع میں چھپا ہوا نظر آئے گا۔ مصرع کیا ہے "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" ہے۔ بات سو فیصدی سچی ہے۔ آفرینش عالم کے وقت بھی درست تھی۔ آج بھی اتنی ہی جنچی تلی ہے۔ ایک طرف تو ان چند لفظوں میں طلب و آرزو کا طوفان چھپا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق" والی بے باکی، رندی اور سرمستی بھی ہے۔

غالب فطرت کے رازداں تھے ان کی نظر بھلا انسان کی ان دو عظیم الشان صلاحیتوں پر کیسے نہ پڑتی۔ یہ صلاحیت شاید ودیعت ہی اس لیے کی گئی تھی کہ انسان [illegible]

رہے۔ اور شاید در پردہ منشائے قدرت یہ بھی ہوگا کہ جرأت رندانہ آپ موت کا سامان کرتی رہے اور فنا و بقا کا توازن قائم رہے۔

یہ واقعہ ہے کہ انسانیت کے خمیر میں اگر "شوق فضول نہ ہوتا تو یہ دنیا آج بھی مٹی کا ٹیلہ یا دلدل بنی رہتی۔ اور بقول جوشؔ۔ اب بھی یہاں آندھیاں ہونکتی رہتیں نہ یہ نظم و ترتیب ہوتی، نہ دل کشی و رعنائی، نہ یہ تنوع ہوتا نہ یہ بوالعجبی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ یہ انسان کا شوق فضول ہی تھا جس نے قوموں اور قبیلوں کو جنم دیا۔ سلطنتوں کی بنیاد رکھی۔ تہذیب و تمدن کا ڈھنڈورا پیٹا۔ ذرے ذرے سے یگانگت پیدا کی۔ فطرت سے تال میل بڑھائی۔" خیابان و گلزار و باغ" آراستہ کیے۔ پرستش و محبت کے زندۂ جاوید نقوش پتھروں پر ثبت کیے۔ اور کائنات کے ہر تار کو مضراب عقل سے چھیڑ کر نغمے پیدا کیے۔ غالبؔ نے اپنے توہم پرست زمانے کو بہترا سمجھایا کہ

بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا

ناہید بہ غمزہ کشت و مریخ بہ قہر

لیکن وہ لوگ سعادت و نحوست کے چکر سے نہ نکلے اور اجرام فلکی سے مرعوب ہی رہے۔ یہ سعادت تو ہمارے اور آپ کے زمانے کی قسمت میں لکھی تھی۔ اس دور کے انسان کی جرأت رندانہ نے کائنات کے لبوں کو چھو لیا اور ماہ و مریخ سے چہلیں ہونے لگیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ صرف اسی شوق فضول نے انسان کو دیوتا ہونے سے بچا لیا اور حیوان کی سطح سے اونچا کر دیا۔

شوق فضول نہ ہوتا تو شعرا کے اشعار پھیکے، ادیبوں کی تحریر بے مزہ، فلسفیوں کی کاوشیں نری حماقت بن جاتیں، وکیلوں کی وکالت ٹھپ اور ایڈیٹروں کے قلم کی روانی رک جاتی۔ عشرت گاہیں سونی اور خانقاہیں ویران ہوتیں۔ اور بیچارے ٹوائیلٹ کے تاجر مکھیاں مارنے لگتے۔

غالب پرانے زمانے کے وضع دار آدمی تھے۔ ان دنوں ترقی پسندی کی ٹھیکے داری کا دستور نہ تھا۔ آج کل کی طرح ہر شیشی پر لیبل لگایا جاتا تھا۔ سچی اور کھری چیزیں کھلے بندوں بکتی تھیں اور ہر آدمی جنرل مرچنٹ ہو سکتا تھا۔ اس لیے غالبؔ نیتا بن سکے نہ کامریڈ۔ سیدھے سادے شاعر رہے۔

قوم کا درد، دنیا سنوارنے کی آرزو اور وطن کی بربادی کا غم ان کے دل میں بھی تھا لیکن کیا کرتے مجبور تھے۔ بوستان خیال تو اس زمانہ میں لکھی جا سکتی تھی، مگر کمپنی باغ میں تقریر نہیں ہو سکتی تھی۔ لے دے کر بس ایک ہتھیار ان کے پاس تھا کہ شعر کہہ ڈالو، اور جو چاہو اس میں کہہ دو۔

اب نئے ادب ہی کو لے لیجیے۔ کس کثرت سے رات کی سیاہی اور سورج کے طلوع کا تذکرہ اس میں ملتا ہے۔ لیکن غالب پچھلی صدی میں اس دور کی خبر دے چکے تھے۔

"مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند — شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند"

بہ ظاہر تو وہ "ساقی و مغنی و شراب و سرود" کے دلدادہ نظر آتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ نصیحت بھی کرتے جاتے ہیں۔

"زینہار از آں قوم نہ باشی کہ فریبند — حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے"

کیا کیا جائے عوام کا مذاق ہی ایسا تھا، جب کبھی وہ دعوت انشاط دیتے تھے۔ کہ

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب — شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

تو خلقت سر دھنتی تھی۔ واہ وا کا شور بلند ہوتا تھا۔ لیکن جب ان کی نظر فلک کج رفتار پر پڑتی، اور جھنجھلا کر خالص مارکسی انداز میں نوجوانوں کو للکارتے کہ

"بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بہ گردش رطل گراں بگردانیم"

تو یوں کہتے۔ بڈھا دیوانہ ہو گیا ہے، اور عوام و خواص بول اٹھتے۔ پتہ نہیں کیا بکتے ہو! "اپنا کہا تم آپ سمجھو یا خدا سمجھے۔" اور غالب دل شکستہ و افسردہ ہو کر کہتے۔

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی — مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

مرزا کی دور رس اور گہری نظروں نے حال اور مستقبل سب کچھ دیکھا۔ اور جب انگریزوں نے دلّی کے باغوں میں اپنے ڈیرے ڈالے اور لال قلعہ پر اپنا پرچم اڑایا تو وہ کلیجہ مسوس کر رہ گئے۔ لیکن نہ جہاد کا دم تھا۔ نہ ستیہ گرہ کرنا آتا تھا۔ چپکے سے اتنا کہہ کر رہ گئے۔

بہ صبح بال فشاناں صبح گاہی را — ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

سیدھی سی بات تھی کہ بھیا یہ کلیلیں جا کر اپنے گھونسلوں میں کرو۔ ہماری شاخوں اور پھولوں کو کیوں تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔

غالب کی حسرت ۸۰ سال بعد ان کے اہالیان وطن نے پوری کر دی اور ان "بال فشانانِ صبح گاہی" کو ان کے گھر واپس کر دیا۔

مرزا کی سیاسی سوجھ بوجھ بھی کچھ کم نہ تھی۔ ٹھیک وہی بات جو ان دنوں دیس کا ہر بڑا آدمی اور سیاست داں کہتا ہے، کتنے لطیف پیرایہ میں غالب کہتے ہیں:۔

بجنگ باج ستاناں شاخسارے را
تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

یعنی یہ بین الاقوامی لوٹ کھسوٹ کرنے والے جو لٹ بھڑ کر تمہارے باغوں کو تاراج کرنے آتے ہیں۔ انہیں دروازہ ہی سے خالی ہاتھ لوٹنے پر مجبور کر دو۔

لیکن یہ سب کچھ کہہ کر جب اہالیان محفل کے تیور دیکھتے تو معذرت کرنے لگتے اور بدلہ سنجی میں پناہ ڈھونڈھتے۔

" بادہ اگر بود حرام بذلہ خلاف شرع نیست
دل نہ تہی بخوب ماطعنہ مزن ہرزشنتا ما "

غالب مومن کی طرح جوتشی نہیں تھے۔ لیکن غضب کے قیافہ شناس تھے۔

آدمی کی طوفان خیز صلاحیتوں کو دیکھ کر انہوں نے کہا ہے۔

" زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد "

لیکن مرزا کے فرشتوں کو بھی خیال نہ ہوگا۔ کہ کبھی انسانیت کے تیور اتنے تیکھے اور انداز اتنے بھیانک بھی ہو سکتے ہیں کہ حسن و عشق اور رنگ و نور سب پناہ مانگیں گے۔

بہر حال غالب نے فارسی میں بھی خوب خوب جولانی طبع دکھائی ہے۔ بس۔ فارسی دیوان کی یہ بدنصیبی رہی کہ اسے کوئی عبدالرحمٰن بجنوری نہیں ملا۔ اور اتنی خوش قسمتی بھی کہ اسے ڈاکٹر عبداللطیف سے سابقہ نہیں پڑا۔ حالانکہ شاعر نہ کسی کے لیے کچھ کہتا ہے۔ نہ کسی وجہ سے کہتا ہے۔ اس کا شوق، اس کا جنون اور اس کا عشق اُسے جدھر لے جاتا ہے۔ جو کہلواتا ہے کہتا ہے۔ غالب نے خود اقرار کیا ہے۔

زمام ناقہ بدست تصرفِ شوق است
بہ سوئے قیس گر آید ز سارباں بنود

رسوائیاں

فرانس کے کسی مسخرے نے ایک بار کہا تھا کہ "بڑے ادیبوں کو بڑھاپے میں دو مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک گٹھیا دوسرے "نوبل پرائز" لیکن یہ یورپ کا ذکر ہے، ہندوستان کے بڑے ادیبوں کو بھی دو مصیبتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ فاقہ مستی اور ریوم رسوائی۔ شاید اسی خوف سے غالب کو آرزو تھی کہ "نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا" اگلے وقتوں میں "میری" اور "سودائی" ہوا کرتے تھے۔ رسوائی سے ہر بھلا آدمی پناہ مانگتا تھا ویسے قلم سے چاہے "زہر عشق" لکھیں یا "امراؤ جان ادا" مگر زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ آپ بیتی بھی جگ بیتی بن کر دنیا کے سامنے آتی تھی لیکن اب تو ادیبوں اور شاعروں نے ایسی منہ پر لوئی کھپرلی ہے کہ جگ بیتی سنا کر دون کی لیتے ہیں "ہم بھی ہیں پانچوں سوار دن میں" بہرحال ذکر ہے میرزا رسوا کا کہ وہ کیا تھے اور انھوں نے کیا کیا ادبی موشگافیاں کی ہیں کیوں کہ جامعہ ملیہ والوں نے طے کر رکھا ہے کسی کو اپنی قبر میں چین سے سونے نہ دیں گے۔ ہر سال کسی نہ کسی کے گڑے مردے اکھیڑے جاتے ہیں۔ اس سال ان پر یہی فکر سوار ہو گئی ہے کہ مرزا محمد ہادی رسوا کون تھے؟ کہتے ہیں رسوا کے باپ کا نام آغا محمد تقی تھا۔ معلوم نہیں یہ وہی آغا تقی تھے جن کے باغ میں کوا حلال تھا

یا کوئی دوسرے۔ یہ سارے تذکرہ نویس اس مسئلہ پر خاموش ہیں۔ حضرت سرشار نے "فسانہ آزاد" میں برسبیل تذکرہ ایک جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔

ہر بچہ کسی نہ کسی سنہ تاریخ اور وقت پر پیدا ہوتا ہے لیکن مرزا رسوا کی آمد اس لیے اور بھی شاندار ہو گئی۔ کیوں کہ وہ عین ۱۸۵۷ء کی بھگدڑ اور دھینگا مشتی کے دنوں عالم وجود میں آئے۔

اسی افراتفری کا شاید ان کے دل و دماغ پر یہ اثر پڑا کہ رسوا کے لیے متلون التحریر بن گئے۔ شیخ سعدی نے کہا ہے۔

"حاجت بہ کلاہ ترکی داشتنت نیست
درویش صفت باش و کلاہ تتری دار"

مرزا رسوا اس مقولہ پر پوری طرح عامل تھے۔ بقول تمکین کاظمی "درویش صورت مجتہد نما" ہوتے ہوئے بھی بی۔ اے۔ کی ڈگری جان کی طرح عزیز رکھتے تھے ان کی معصوم عیاشیوں میں حسن پرستی اور نظر بازی کے ساتھ، سائنس، ریاضی، مذہب اور فلسفہ سب کچھ شامل تھا۔

رسوا نے بہت سی کتابیں لکھیں اور ہر تصنیف کا رنگ۔ بو۔ مزہ سب جدا جدا ہے۔ انداز تحریر بھی بدلتا رہتا ہے اس میں شک نہیں اہل دل اور اہل زبان کہیں بند نہیں ہوتے۔ وہ کھرے خشک مزاج اہل علم کی صحبت سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ

کے بھی دلدادہ رہتے ہیں۔

مرزا رسوا کی شان ہی نرالی تھی۔ ایک بغل میں پیمائشی آلات اصطرلاب وغیرہ دوسری میں ریاضی و فلسفہ کی چھکڑا بھر کتابیں دبی ہوئی ہیں اور نظریں ہیں کہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

ساتھ ہی ساتھ دل میں درود شریف بھی پڑھتے جاتے ہیں۔

خدا بھلا کرے بی امراؤ جان ادا کا کہ انھوں نے اس پیمانہ میں چھلک کر رنداں مے خانہ کو لب سوز لب بند کر دیا، ورنہ سچ پوچھیے تو بحیثیت ناول نویس کے مرزا کے پاس مسجد کی بدھنی اور ترکل کا قلم یا انگریزی ہولڈر کے سوا دھرا ہی کیا تھا۔ اللہ ہی جانے رسوا میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے تھے۔ جو ترقی پسندوں کو ان کی یاد آئی آن۔ بچارے نے شاعری تو بچپن سے کی مگر سارے جذبات، امنگیں اور تمنائیں، ریاضی اور فلسفہ کے بوجھ تلے دب کر چرّ مرّ ہو گئیں۔

فطرت انسانی کی بوقلمونی کے کرشمے دیکھتا ہوں تو ان گنت نمونوں کو دیکھنا چاہیے جو ادیبوں شاعروں اور مفکروں کے روپ میں یہاں جلوہ گر ہوا کرتے ہیں۔

مرزا رسوا کو آنکھوں دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ وہ باوجود علم و فضل کے ایک مخصوص قسم کی سنک کا شکار تھے۔ بقول اصغر

بندگی جنوں ادا بیخودی ادب سرشت
حسن کی اصطلاح میں عشق اسی کا نام ہے

اسی "بیخودی ادب سرشت" کا تقاضا تھا کہ زبان سے کچھ نہ کہتے مگر بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی سمجھ کر "کرسئ جاناں" کو برسہا برس تک حرزِ جان بنائے رہے۔ ان کے گھر کے چبوترہ پر روزانہ جھیڑ کا ڈھونا آرائش ہوتی اپنی کرسی بھی نکلتی اور ایک کرسی اور بھی نکالی جاتی۔ یہ سب پندرہ بیس برس تک ہوتا رہا۔ مگر وہ کم بخت کرسی یہی پکار پکار کر کہتی رہی۔

"انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی"

اس وقت میرے سامنے رسوا کی "امراؤ جان ادا" بھی ہے اور "خونی شہزادہ شریف زادہ۔ مرقع لیلیٰ مجنوں اور بہرام کی رہائی بھی کھلی پڑی ہے اور سب کچھ دیکھ کر مرزا رسوا کے مزاج طبیعت علم اور طرز تحریر کسی کا بھی تو صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ کوئی اور چھور ملتا ہی نہیں۔

مرقع لیلیٰ مجنوں ایک منظوم ناٹک ہے۔ ابتدا نثر مقفٰی سے ہوتی ہے۔ بڑی اچھی تک بندی ہے۔ خوب جوڑ توڑ ملایا ہے لیکن ایسا لگتا ہے ذرا سی دیر میں سانس پھول گئی اور معمولی بول چال پر اتر آئے۔ لیلیٰ مجنوں دونوں پکے ہندوستانی ہیں مگر رہتے نجد میں ہیں۔ ایک خونخوار پٹھان اور لکھنؤ کی خیلا بھی اس میں جلوہ گر ہے۔ اس صنف کلام کو چاہے مثنوی کہتے ہوں یا کچھ اور۔ مگر اس میں غزل۔ واسوخت۔ مرثیہ۔ قصیدہ اور ہزل سب کی ملاوٹ ہے۔ ڈرامہ جو ٹھہرا نا۔ کہیں زبان لکھنوی ہے کہیں قصباتی۔ کسی جگہ مولویت جھانک رہی ہے اور کہیں کرخنداریت کھلی پڑی ہے حاشیہ پر اور نیچے نوٹ میں اشعار کے وزن۔ بحر اور دوسری علمی اصطلاحوں مثلاً مکسوف۔ محذوف۔ کامل۔ غزل مرقعہ وغیرہ کی طرف اشارہ اور تشریح ہے۔ ویسے نوسیکھے شعراء کے لیے بڑی کارآمد چیز ہے۔ میرے پڑھے نہ پڑھی گئی اس لیے معافی چاہتی ہوں۔

رہا شریف زادہ تو وہ اتنا مقطع سنجیدہ۔ ٹھیک ٹھاک اور کولھو کا بیل ہے کہ اس سے بھی پوری طرح نبھانا دشوار ہو گیا۔ میں تو کہتی ہوں دھن ہے میرزا عابد حسینؒ کی بیوی کو۔ نہ جانے کیسے ساری زندگی اس لوہے کی لاٹھ پر سر پٹکتی رہی ساری کتاب بمشکل پڑھی اور ختم کرتے ہوئے ایسا لگا جیسے میں ابھی طالب علم ہوں اور ماسٹر صاحب کہہ رہے ہیں۔

اے غافل! محنت کرو، محنت کرو

اسکولوں میں بچوں کو پڑھانے کے لیے اس میں بڑے اچھے سبق ہیں ٹھنڈے ٹھنڈے کاروباری خطوط ہیں۔ لیبورٹیری۔ لائبریری اور سائنسی تحقیقات کا شوق دلایا گیا ہے مگر امراؤ جان ادا والے میرزا رسوا اس میں کہیں ڈھونڈے نہیں ملتے۔

اب دیکھیے خونی شہزادہ اور بہرام کی رہائی۔ سو ان دونوں کے متعلق کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ "جاسوسی دنیا" کے ابن صفی نے مار دھاڑ۔ قتل و خون۔ زہر خورانی اور فریب دہی کے وہ وہ طریقے ان چند سالوں میں ایجاد کر دیے ہیں کہ بہرام اور خونی شاہزادہ ان سب کے سامنے طفل مکتب نظر آتے ہیں۔

صفحات کاغذ پر ایک کہانی بکھری ہوئی ہے جس کا نہ کوئی پلاٹ ہے نہ طرز بیان نہ گہرائی نہ تسلسل۔ نہ زبان کا چٹخارا ہے نہ علمیت کا گمبھیرپنا۔ نہ یہ ترجمہ معلوم ہوتا ہے نہ تصنیف۔

بہرحال لے دے کر بی امراؤ جان ادا ہی محفل میں رہ جاتی ہیں جو مرزا رسوا کا ہاتھ پکڑ کر ادیبوں کی مسند پر بٹھا دیتی ہیں۔

اس ناول میں غضب کی دلکشی ہے۔ بلا کی سادگی ہے۔ سچائی ہے۔ نیچرل انداز بیان بھی ہے لیکن زبان کے بارے میں مجھے شبہ ہے مثلاً

منشی احمد حسین کے پڑوس میں جب رسوا کی ملاقات مدتوں کے بعد امراؤ جان سے ہوتی ہے تو شکوہ شکایتوں کے بعد مرزا رسوا ان سے اصرار کرتے ہیں کہ محفل میں چل کر بیٹھیے۔

امراؤ جان جواب دیتی ہیں "مجھے کوئی عذر نہیں مگر خیال ہے صاحب خانہ یا اور کسی صاحب کو میرا آنا ناگوار نہ ہو۔

اس وقت مرزا فرماتے ہیں۔ آپ کے حواس درست ہیں۔ بھلا ایسی جگہ میں آپ کے

چلنے کے لیے کیوں کہتا۔ بے تکلف صحبت ہے۔ آپ کے جانے سے اور لطف ہوگا۔

لکھنؤ کی زبان اور لب و لہجہ پر ان دنوں ایسی دھار رکھی جا چکی تھی کہ اس انداز تخاطب اور الفاظ اور جملوں کو کوئی لکھنؤ والا شاید مشکل سے لکھنوی کہے۔

آگے چل کر ایک جگہ میر اکبر علی کی بیوی کی ایک بڑھیا سے تو تو میں میں ہو رہی ہے۔ اکبر علی کی والدہ بڑھی کو ڈانٹتی ہیں۔

"چل شفقت تو کیا بدلہ لے گی۔ ذرا کسی بھلائے پر نہ بھولنا اور پھر بہو کو سمجھاتی ہیں" اری بٹیا تم نے تو نگوڑی کو ناحق پیٹ ڈالا اور پھر ایک موئی شفقت بازاری کے لیے آخر تمہیں اس کی پر چپ لینا کیا ضروری تھی۔

اسی طرح سے اور بہت سے جملے خصوصاً مرزا رسوا کی زبانی ایسے ہیں جن میں وہ نرمی لوچ اور نفاست نہیں ہے جو لکھنؤ کے روزمرہ کا جزو ہے۔

مگر پھر بھی "امراؤ جان ادا" ایک خاصہ کی چیز ہے۔ اس زمانہ کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ جب بقول چودھری محمد علی ردولوی۔ شرفا کے بچے علم مجلس حاصل کرنے کے لیے چوک کے بالا خانوں پر زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ جب ستر سال کے عالم و فاضل پیر بزرگ عشق حقیقی تک پہنچنے کے لیے عشق مجازی کی پہلی سیڑھی بسم اللہ جان جیسی شوخ و شنگ طوائف کو بناتے تھے۔ جب مائیں خود لڑکیاں خرید کر صاحبزادوں کے دل بہلاؤ اور تفریح کا سامان مہیا کرتی تھیں اور جب بیگمات نائکہ سے اپنے لڑکوں کے لیے سمجھوتہ کرتی تھیں اور میرزا رسوا جیسے ثقہ حضرات بھی نظر بازی کا لپکا رکھتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

اچھے رنگین دن تھے اور پر کیف راتیں تارے ڈوب رہے تھے، رات بھیگ رہی تھی اور اودھ کی شمع آخری لو دے کر بجھ جانے کے قریب تھی اور پھر

رو رو کے گزاری شب غم شمع نے لیکن

آدمی کے قلم سے کبھی کبھی ایسی کوئی چیز نکل جاتی ہے، ایک جملہ ایسا زبان پر آجاتا ہے، ایک کام زندگی میں ایسا ہو جاتا ہے جو "ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما" کا مصداق بنتا ہے۔

ضروری نہیں ہے کہ ہر بات ہر کام اور ہر تصنیف قابلِ اعتنا ہو۔ یا ہر قول اس کا ضرب المثل بن جائے یا ہر نقش شاہکار کہلائے لیکن جب پوسٹ مارٹم کیا جائے گا تو سب کچھ دیکھنا ہی پڑے گا۔ اور میری ہی طرح مایوس ہونا پڑے گا۔

امراؤ جان ادا اور میرزا رسوا ایک جان دو قالب ہو چکے، ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر رسوا نے اور جو کچھ لکھا وقت۔ حالات اور ضرورت سے مجبور ہو کر یا بیکاری کے مشغلہ کے طور پر لکھا ہے۔ وہاں آمد ہے۔ یہاں آورد۔ وہاں حقیقت ہے یہاں بھونڈا تصنع ایک لائق فائق آدمی اور صاحبِ علم شخصیت کو زندہ رکھنے کے لیے ایک جملہ بھی کافی ہے نہ کہ مجسم امراؤ جان ادا مع اپنے دورِ تہذیب اور محفل کے۔

اس کے علاوہ "مثنوی فسانہ رسوا" نے خود مرزا صاحب کی شخصیت، وضع داری اور عاشق مزاجی پر سے ایسا پردہ اٹھا دیا ہے کہ اس کے بعد نہ کسی تبصرہ کی حاجت رہتی ہے نہ تنقید کی۔

ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب
اے تلوّن کیش تو مشہور بھی رسوا بھی ہے

منشی پریم چند اور ان کے ناول

کبیر کا دوہا ہے۔

سب سے ہلیے سب سے ملیے سب کے لیجے نانو
ہاں جی ہاں جی سب سے کہیے بسیے اپنے گانو
کبیرا لوہا سب ایک ہے گڑھنے کا ہے پھیر
لوہے سے بکتر بنے لوہے سے شمشیر

سو بھئی فنکار کا قلم بھی لوہے سے کچھ کم نہیں۔ وہ انسان کو دیوی دیوتاؤں کے استھان تک بھی پہنچا سکتا ہے اور پاتال کی سیر بھی کرا سکتا ہے۔ یہی قلم مہابھارت لکھتا ہے اور یہی قلم بائبل کے خشک و سخت احکام میں تاریخی کہانیاں بن کر رنگینی پیدا کر سکتا ہے، اسی سے گیت لکھے جاتے ہیں اور اسی سے ہجو۔

کہانیاں کہنے، کہانیاں سننے اور کہانیاں گڑھنے کا شوق شاید انسان کا فطری ذوق ہے۔ داستان سرائی کے شوق نے اردو میں داستان امیر حمزہ۔ بوستان خیال، فسانۂ آزاد جیسی طویل داستان در داستان ناولوں کو جنم دیا اور انسان کو زندگی کی حقیقتوں سے فرار کا راستہ دکھایا۔ انیسوی صدی کے مصنف عام طور سے اس دنیا سے قطع نظر کرنے بلکہ اس کے وجود تک سے منکر ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ بڑے زوردار

لوگ تھے۔ آپ اگر ساٹھ ستر برس بلکہ سو برس پیچھے نظر ڈالیے تو دیکھیں گے کہ کوئی مصنف صاحب گُل کے گھوڑے یا اڑن کھٹولے پر سوار تشریف لا رہے ہیں تو کوئی جادو کے زور سے دنیا الٹ پلٹ رہے ہیں کوئی اندر جی کے سنہرے رتھ پر سوار ہیں تو کوئی راجہ اندر کی محفل میں اپسراؤں کا ڈانس دیکھ رہے ہیں یا دیووں اور پریوں کے جھرمٹ میں شہزادہ گلفام بنے بیٹھے ہیں لیکن ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کا غدر کیا ہوا۔ لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور سب کے سب زمین پر اتر آئے۔ زمین میں ان دنوں دھرا ہی کیا تھا۔ اس افراتفری میں سب کچھ لٹ چکا تھا۔ تباہی و بربادی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ غربت جہالت اور بے حسی کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ امارت کے دیے ٹمٹما رہے تھے اور انگریز اپنے گورے گورے ہاتھوں سے تھوڑا تھوڑا تیل دے کر ان کی مدھم ہوتی ہوئی لو تیز کر رہے تھے۔

ان دنوں بڑے ادیبوں نے خانقاہوں اور دھرم شالوں میں بیٹھ کر دین دھرم پر قلم سنبھال لیے۔ کچھ نے ماضی پر نظریں جما لیں اور گڑے مردے اکھیڑنے لگے کچھ بول چال کی درستی پر جُٹ گئے اور کچھ نے دیوتاؤں جنوں اور بھوت پریت سے دامن چھڑا کر اپنی جیتی جاگتی دنیا کی طرف رخ کر دیا۔ ؎

چاند کو چھونے کا قصہ بھول پی جانے کی بات
ہر سہانی آرزو اب تک ہے دیوانے کی بات

آخر کار وہ وقت آ ہی گیا کہ جب کہانیوں نے آپ بیتی اور جگ بیتی کا روپ دھار لیا واردات قلبی اور جذباتیت پر انسانی زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سایہ پڑنے لگا۔ اور کہیں اوسان کہیں سب کی سُن گُن لینے پر ادیب تل گئے۔

پریم چند جی کو زمانہ سازگار ملا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی ناول (اگر ان کو ناول کہہ سکیں تو) گھر گھر پڑھے جا رہے تھے۔ شرر کے غلط سلط تاریخی حوالے حسن و

عشق کی چاشنی کی بدولت مقبول عوام ہو چکے تھے۔ سرشار کی فسانۂ آزاد نے زبان و بیان کی محفل میں تمغۂ امتیاز حاصل کر لیا تھا۔ غیر ملکی ناولوں کے بکثرت ترجمے بازار میں آ چکے تھے اور راشد الخیری کے خونی آنسو، حریف مئے مردافگن عشق کو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا صلائے عام دے رہے تھے۔

اردو داں پبلک پوری طرح ہوش مند ہو چکی تھی، ایسے میں پریم چند جی نے ایک نئے سادہ، دل نشین انداز سے سماج، گھر، مذہب اور قانون کی کمزوریوں پر سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

میں نے ابھی ذرا دیر پہلے کہا تھا کہ پریم چند جی کو زمانہ سازگار ملا۔ اس کو آپ روپے پیسے میں نہ تولیے۔ ہندوستان نے اب سے پہلے جتنے ادیبوں کو جنم دیا ہے سب مفلس ہی مرے اور میرا خیال ہے انیسویں صدی تک کسی ملک میں بھی کوئی ادیب پیٹ بھر کر کھانا کھا کر یا گدگدے بستر پر لیٹ کر نہیں مرا ہے علم اور دولت کا گٹھ جوڑ تو اس بیسویں صدی میں ہونے لگا ہے اور اہل علم اپنی موت بھی مرنے لگے ہیں ورنہ اس سے پہلے تو اکثر حکومت ہی ان کو وقت سے پہلے مصیبتوں سے چھٹکارا دلایا کرتی تھی۔ پریم چند جی کو مفلس ہندوستان سے سابقہ پڑا۔ ملک نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ قدر دان پبلک نہ بے حس تھی نہ بہری۔ اس نے ان کے ہر ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تحسین و آفرین کے پھول ان کے قدموں میں نچھاور کیے مگر ۱۹۳۶ء سے پہلے ان کے بیٹوں کو بھی لکھ پتی نہ بنا سکی۔ اور مجھے اب بھی اس میں شبہ ہے کہ پریم چند جی کی تصنیفات سے ان کے بیٹے دولت کے ڈھیر لگا سکے ہوں گے۔ ایک بات اور بتا دوں کہ انگریزیت کے عروج نے تعلیم یافتہ طبقے کو بڑی حد تک اپنے قومی لٹریچر سے بیگانہ کر دیا تھا مگر ردعمل دوسری جنگ عظیم کے بعد شروع ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر جھنجھوڑ کر سب کو ہندی اردو ادب کی طرف متوجہ کر دیا۔

اس کے اثر سے نہیں بچ پاتا۔ ہوری ایسا ٹپیکل کسان کردار ہے جو صدیوں کی غلامی کے باوجود اپنے اندر ان اعلیٰ انسانی قدروں کو باقی رکھنے پر مصر ہے جن سے انسانیت قایم ہے۔ سود۔ بیگار۔ غلامی اور افلاس کے تلے دبے ہوئے کسان کی چیخ گئودان کے سُر میں جب بلند ہوتی ہے تو ملک میں کسان سبھائیں بن جاتی ہیں۔ ریونیوبل پاس ہوتے ہیں زمینداری ابالش ہو جاتی ہے اور لینڈ ریفارم کے قصے چل پڑتے ہیں، پریم چند نے ناول اور مختصر افسانے کے ذریعے سوتوں کو جگایا، دل دماغ کو غور و فکر پر مجبور کر دیا، انسان فطرتاً ظالم اور بے رحم ہے، پریم چند اس کے قائل نہ تھے۔ وہ کرداروں کی نیک فطرت پر بھروسہ رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے ناولوں کے کردار لاکھ گمراہ ہوں، مدتوں بھٹکتے رہیں، ہر برا فعل کر لیں مگر ان کا ضمیر، زندہ رہتا ہے اور ضمیر کی آواز ان کو کسی نہ کسی وقت مذہب کی طرف کھینچ کر سدھار ہی دیتی ہے۔

ان کے ناول اس دور کی سوسائٹی کی تصویر ہیں جس میں فرد اور جماعت امیر غریب کسان مزدور اور سرمایہ دار اور زمیندار سب ایک کشمکش میں مبتلا ہیں۔ حکومت کا رعب اور ملک کا ناقص قانون ان کے گرنے میں اور زیادہ مدد کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ناول کے ذریعے انسانی شعور نے جس وسعت و گہرائی کا ثبوت دیا ہے وہ بہت کم دوسری صنف ادب انجام دے سکی ہے۔

پریم چند کے ناول ہندوستانی مشترک سوسائٹی اور ہندو سوسائٹی کی بھرپور تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ناول میں اس متلاطم دنیا کی حقیقی تصویر ہے جس میں بھلے اور برے ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے انفرادی زندگی سے بھی بحث کی ہے اور اس سماج کا نقشہ کھینچا ہے جس میں فرد اور سماج کا درمیانی توازن ختم ہو رہا تھا، اسی لیے ان کے ناول انسانی جذبات کے آئینہ دار ہیں۔

پریم چند ہندوستان کے نئے دور کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ دیہاتی زندگی کی رومانیت اور جاگیرداری دور کے غلامانہ بندھن ٹوٹ رہے تھے۔ انھوں نے گاؤں کے پنگھٹ سے گیت نہیں چرائے، لوک گیت نہیں اکٹھا کیے مگر کوٹھریوں میں سلگتی ہوئی آہیں، جھونپڑوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو اور پھٹے چھتڑوں میں دھڑکتے ہوئے دلوں کی دھڑکنیں اکٹھی کیں اور انہیں سیدھے سادے طریقہ سے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

پریم چند سے پہلے امراؤ جان ادا چھبیلی بھٹیاری اور دوسری کتابیں معرض وجود میں آ چکی تھیں جن میں طوائف کو مختلف حیثیتوں سے پیش کیا گیا تھا۔ طلسم ہوشربا میں تو خیر جتنے زنانہ کردار ہیں سبھی کو "رنڈی" کا لقب حاصل تھا۔ فسانۂ آزاد میں بھی اللہ رکھی اور اس قبیل کی دوسری عورتیں باوجود مصنف کے حسن ظن کے پستی کی اس سطح پر ہیں جہاں سے ان کا ابھرنا مشکل نظر آتا ہے۔ امراؤ جان ادا ایک ایسی داستان ہے جس میں کھل کر منظر اور پس منظر نظر کے سامنے آیا ہے۔ اس میں راز دروں پردہ بھی ہے اور سوسائٹی کی کمزوریاں بھی۔ شورِ بازار بھی ہے اور دبی گھٹی آہیں طوائفوں کی آن بان، بذلہ سنجی، اور علم دوستی کا خوب ڈھنڈورا بھی پیٹا گیا ہے۔ لیکن اس صورت حال کا بھانڈا بھی پھوڑا گیا ہے جو اچھی بھلی ہستیوں کی گراوٹ کا باعث بنتے ہیں۔

لیکن پریم چند نے نہ صرف اس دکھتی ہوئی رگ کو پکڑ لیا بلکہ اس کے اندر دوڑتے ہوئے تازہ اور گرم خون کو بھی دیکھ لیا۔ انھوں نے اس کی خرابیاں بھی محسوس کیں، اس کی حالت پر افسوس بھی ہوا اور اس مرض کے اسباب اور اس کے علاج پر بھی سنجیدگی کے ساتھ سوچ بچار کیا۔ پہلی بار بازارِ حسن میں ایک ایسے ہوم یا گھر کا نظریہ پیش کیا گیا جہاں ایسی عورتوں کو اصلاح حال کا موقع دیا جاسکے

اردو ادب پر روسی اثر

اس سے پہلے کہ میں اردو ادب پر نئے خوشگوار اور ناخوشگوار اثرات کا تذکرہ کروں یہ مناسب ہوگا کہ اس پس منظر کی بھی ایک جھلک دکھادوں جس میں کمیونزم پروان چڑھا بلکہ سچ پوچھیے تو اس دور کی عالمگیر بے اطمینانی اقتصادی گڑبڑ اور سماجی تزلزل ہی نے سوشلزم اور ترقی پسندی کا روپ دھار کر ہندوستان میں ذہنی اور دماغی انقلاب برپا کیا۔

۱۴ء سے ۱۸ء تک والی جنگ جسے اس وقت کے لوگ جنگ عظیم کہا کرتے تھے۔ (حالانکہ دوسری جنگ عظیم اس سے بڑھ چڑھ کر ہوئی اور تیسری جنگ عظیم کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔) اپنے خاتمہ پر بہت سی نئی نئی چیزیں ہندوستان لائی مثلاً ڈنگو بخار۔ انفلوئنزا۔ ریڈیو۔ ہوائی جہاز غریبوں کی لاج رکھنے والا جاپانی نقلی ریشم اور سب سے بڑھ کر روس کا نیا انوکھا نظریۂ حیات۔ ان میں سے کچھ چیزیں تو زور و شور سے ملک میں داخل ہوئیں اور کچھ چپ چپاتے دبے پاؤں۔ روسی تخیل اور ادب بھی اسی طرح آیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور وہ سیدھا کالج اور یونیورسٹیوں میں پہنچ کر ملک کے نوجوان دماغوں کو ٹٹولنے لگا اور جب آنکھ کھلی تو باغیانہ جذبات ابھر رہے تھے۔ سرگوشیوں میں دور دیس کے انقلاب پر تبصرے ہو رہے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی بن چکی تھی اور سیاستِ عالم پر

بالشویک نقطہ نظر سے غور کیا جارہا تھا۔ برٹش گورنمنٹ روس کی اس بدمعاشی پر دانت پیسنے لگی۔ انگریزوں نے پانی پی پی کر لینن کو کوسا۔ کارل مارکس کو صلواتیں سنائیں اور مذہب کے نام پر دنیا بھر کے قدامت پسندوں کو اس نوجوان اور سرکش گروپ سے بھیڑا دیا۔

ہندوستان میں اس وقت شدید سیاسی بے چینی تھی۔ اس لڑائی میں بچارے ہندوستانی "مارے موچھوں والا اور پکڑا جائے داڑھی والا" کی طرح پکڑے گئے تھے۔ خدا واسطے کو گرانی۔ افلاس اور جنگی چندوں نے ان کا فشار ڈھیلا کر رکھا تھا۔ لوٹا مارا ملک تھکاوٹ اور اقتصادی تباہی کی بدولت یونہی بے اوسان ہو رہا تھا۔ برٹش گورنمنٹ نے کالے پیلے قانون گڑھ کر اور بھی "موئے پر سو دُرّے" لگا دیے۔ حکومت کی مشینری جو دوران جنگ میں صرف روپیہ بٹورنے کے کام میں لگی رہتی تھی اکبارگی فاقہ کشی اور نیم جان ہندوستانیوں پر پل پڑی کیونکہ ہندوستان کا زرعی مسئلہ شدت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور پہلی مرتبہ ملک کی کارکن جماعتوں کے سامنے غلامی اپنے بھیانک روپ میں پیش ہوگئی تھی۔ عوام نے آواز اٹھائی حکومت نے سختیاں کیں۔ مایوسی و بے چینی سے مغلوب ہو کر آل انڈیا نیشنل کانگریس کو سرکار سے پہلی ٹکر لینا ہی پڑی۔

ان دنوں اخبارات اور رسائل بالشویک کے کارنامے ان کے نظام حکومت ان کے نظریہ مساوات کو اس بری طرح توڑ مروڑ کر مضحکہ خیز بنادیا کرتے تھے کہ ہر لغویت اور حماقت کے لیے لفظ بالشویک اور بورژوا استعمال ہونے لگا تھا۔ ہندوستانیوں کو خاص طور سے یہ مشورہ دیا جاتا تھا کہ سوویت روس ایک ایسی چھوت دار مہلک بیماری ہے جس سے قوموں کی موت یقینی ہے اور اس میں مبتلا ہو کر انسانیت، عورتوں کی عزت مذہب و ملت کوئی چیز بھی محفوظ نہ رہ سکے گی۔

۱؎ نظریہ تو عوام کا اس ...

لیکن جوں جوں واقفیت بڑھتی گئی لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا کمیونزم نے ایک بڑا مسئلہ مزدور و سرمایہ دار کا اٹھایا تھا۔ انفرادی آزادی اور شہری حقوق کے تذکرے شروع کر دیے تھے۔ مساوات بین الاقوامی بھائی چارہ اور طبقاتی فرق کو ختم کرنے کی تجویز دنیا کے سامنے پیش کی اور غریبوں کے معیار زندگی کو اونچا کرنے کی تحریک شروع کی۔

ناممکن تھا کہ ہندوستان جو خود اس وقت ان تمام مشکلات کا شکار تھا، اس سے متاثر نہ ہوتا اور یہ بھی ناگزیر تھا کہ زبان و بیان پر اس کا اثر نہ پڑتا۔

انہیں دنوں سازش میرٹھ والا مقدمہ چلا۔ نوجوانوں کا ایک گروہ اس میں ماخوذ ہوا۔ اخبارات نے توڑ توڑ کر کارروائی شائع کی۔ بلکہ بہت کچھ کھا گئے لیکن ستم ظریفوں نے بند کمرے میں دیے گئے بیانات کو چھپوا کر ہاتھوں ہاتھوں ہاتھ تقسیم کر دیا اور اس طرح کمیونزم کا اچھا خاصا پروپیگنڈا ہو گیا۔ عوام اور نو تعلیم یافتہ طبقہ پہلی بار کارل مارکس اور اس کی تھیوری سے روشناس ہوا۔

اس سیاسی کشمکش سے آخر ادب کا دامن کہاں تک محفوظ رہتا شعر و ادب بھی اس برقی لہر سے متاثر ہوئے۔ خود ڈاکٹر اقبال نے انقلاب روس پر اظہار مسرت کیا اور اس "جہان نو" کی تعمیر سے خوشگوار امیدیں وابستہ کیں لیکن ان کا خداشناس دل روس کی لامذہبیت سے منغض ہو گیا۔ دنیا کی بہتری و بہبودی کی توقعات قائم رکھتے ہوئے انہوں نے داعیان انقلاب کو یہ مخلصانہ مشورہ دیا۔

بگذر از لا جانب الا خرام

یعنی انکار و نفی کی منزل سے گزر کر ذرا اثبات و ایمان کی طرف بھی ٹہلتے چلے جاؤ۔

قوموں کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند

می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

اور ایسے وقت میں تعمیر و تخریب کا ساتھ کبھی نہیں ہوا کرتا۔ ہاں تخریب جب اپنی آخری منزلوں سے گزرنے لگتی ہے تب تعمیر سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ ہندوستانی ادب پر بھی وہ وقت آن پڑا تھا اور تخریب نے پرچم کھول دیے تھے۔

یہ وہ دور تھا کہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے جھگڑوں کو اقبال کی پنچایت طے کر چکی تھی۔ چکبستؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اور خود اقبالؔ کسی نہ کسی ڈھنگ سے شعر کو سیاست سے آلودہ کر چکے تھے۔ اردو ادب میں ان دنوں ناولوں کی بہتات تھی۔ ترجموں کے ڈھیر تھے، دیوانوں کا انبار تھا اصلاحی اور تاریخی تصنیفات کی طرف رجحان تھا۔ مختصر افسانہ کی ابتدا تھی اور غزل کی انتہا تھی اور یہ سب زندگی سے کچھ بہت دور بھی نہ تھے۔ لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اتنے بہت قریب بھی نہ تھے جو ان میں ہم اپنے دل کی دھڑکن، اپنی آہوں کا دھواں اور اپنی زندگی کی کشمکش دیکھ سکیں۔ پریم چند دیہات کی سادہ زندگی اور وہاں کے چھوٹے بڑے مختلف مسائل کو منظر عام پر لا رہے تھے۔ لیکن ریشم میں لپٹی ہوئی گندگی اور جوہر میں پڑے ہوئے نگینہ کو کرید کر نکالنے والا کوئی نہ تھا۔ وضعدار لوگ روایتی اصولوں اور اپنے خود ساختہ تصورات پر جمے رہ کر نئے دور سے نبٹنا چاہتے تھے۔ آبا و اجداد کے نقش قدم پر مضبوطی سے پاؤں جمائے کھڑے تھے اور ادب کو سیاست کے کانٹوں سے بچانے پر ان کا ایمان تھا۔ اس لیے ان سرپھرے نوجوانوں کو کھرپا، کلہاڑا اور درانتی سنبھالے گلستان ادب کی طرف آتے دیکھ کر باغبانوں میں ہل چل مچ گئی۔

ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ آنے والے آ گئے لیکن انہوں نے بھی بدتمیزی اور گستاخی کی حد کر دی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے چند "انگارے" چند مضامین کا

مجموعہ تھا جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا) خرمن ادب پر پھینک مارے "انگارے" کے مصنفین کا کوئی مقصد تھا نہ فائدہ۔ شاید وہ صرف ہوا کا رخ دیکھنا چاہتے تھے یا پرانی دنیا والوں کو ذرا سا چونکا دینا بھی مقصود ہو۔ بہر حال یہ کوئی نہ جان سکا۔ البتہ بزرگوں کی محفل میں کھلبلی مچ گئی۔ مہینوں تو تو میں میں اور تقریر و تحریر کا سلسلہ جاری رہا مصنفین پر کفر کے فتوے لگے سماج سے اخراج کی دھمکیاں دی گئیں اور مصنف ایسے نٹ کھٹ کہ دور کھڑے ہوئے اپنی پھینکی ہوئی آتش بازی سے لوگوں کی بوکھلاہٹ اور بھاگم بھاگ کا تماشا دیکھتے رہے۔ میری آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر انگارے میں ایسی کیا قابل اعتنا چیز تھی جو اس کی طرف اہل دماغ متوجہ ہو گئے۔ یہ بیہودگی تو چند ماہ بھی نہ زندہ رہتی اگر مولویانہ متانت نوجوانی کے اس لفنگے پن سے دست و گریبان نہ ہو جاتی اس ساری تکا فضیحت کا یہ نتیجہ ہوا کہ حجاب مٹ گیا، پردے اٹھ گئے۔ بساط سیاست اور شاہراہ ادب دونوں پر چہل قدمی شروع ہو گئی۔

انگارے کی اشاعت کے بعد کچھ دنوں تک سکون رہا۔ لوگ نادانی سے سمجھ بیٹھے کہ "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" لیکن زیادہ دن نہ گزرنے پائے تھے کہ اطمینان ہیجان میں تبدیل ہو گیا۔ اور ترقی پسندی کے آسمان سے شعلے، چنگاریاں، بگولے اور اولے[1] برسنے لگے۔ قدامت پسندوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ ادب ٹھوس علمیت اور رومانیت کے سہارے یا مذہب کی سپر لے کر اس طوفان کو سہار لے جائے لیکن وہاں دم لینے کا یارا کب تھا جب چونکے تو دیکھا۔

سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے

[1] جدید افسانوی ادب۔

پھر تو اس تیزی سے نظم و نثر پر وبا پڑنا شروع ہوا کہ بڑے بڑے سورما میدان چھوڑ بھاگے یا اسی رنگ کو اپنا کر "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کہہ کر ساتھ ہو لیے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو صرف کف افسوس ملتے رہے۔

اس کشمکش کا اثر کچھ اچھا نہیں پڑا۔ بیچاری اردو جس کے گیسوؤں کو سنوارنے کی ڈاکٹر اقبال کو بڑی فکر تھی اور ان گیسوؤں کو اپنے اپنے زمانے کے فیشن اور مذاق کے مطابق سب ہی علماء و فضلاء نے سنوارا تھا۔ جن پر امیر مینائی اور داغ افشاں چنتے رہے تھے۔ اور نذیر احمد نے عربی فارسی کی گوند چپکائی تھی۔ پریم چند نے سرسوں کے پھول اور نیمکولیوں سے جن کی آرائش کی تھی اور علامہ راشد الخیری آنسوؤں کے موتی جن میں پروتے رہے تھے۔ ہاں صاحب وہی گیسو اس افراتفری میں اس بری طرح کھسوٹے گئے کہ یقیناً غالبؔ و حالیؔ کی روح قبر میں کروٹیں بدلنے لگی ہوگی۔ زیورات اتار کر ہنسیا اور بسولے کی نشانی پہنا دی گئی۔ سر پر کانٹوں کا تاج ہوا۔ کپڑوں پر خون سے گلکاریاں کی گئیں اور تنکر مل کے شیرے میں لتھڑ کر اسے اچھی خاصی "ہیّا"[1] بنا دیا گیا۔

جھگڑے میں اور ہوتا ہی کیا ہے۔ کوئی لڈو تھوڑی بٹتے ہیں۔ دنیائے ادب میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ نئے ادیب وہمی اور فرضی چیزوں پر اعتقاد نہ رکھتے تھے۔ وہ عالم کو "حلقہ" دام خیال" ماننے سے منکر تھے۔ زندگی کو جاوید مستحکم اور انسان کی منزل اعلیٰ مانتے تھے" اور سب کچھ یہیں ہے" کے اتنے معتقد تھے کہ ساری روایات کہنہ اور ادبی دفتر اُن کو قدامت پسندی کی گٹھری دکھائی دینے لگے بقول حافظ

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

ہر جگہ ان کو غلامی اور جہالت کی بو آتی تھی اس لیے بڑی بیدردی سے

[1] ہیّا کوئی خوفناک چیز جس سے شریر بچے ڈرائے جاتے ہیں۔

انہوں نے ادب کا پوسٹ مارٹم کرنا شروع کر دیا۔

سیاسی طور پر کانگریس کی چٹان ان کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ اس راہ کے روڑے کو ہٹائے بغیر ملک و قوم تک رسائی ناممکن تھی۔ حکومت اور سوسائٹی بھی دونوں ان کے خلاف سرگرم تھیں۔ مجمع عام میں اظہار خیال کیا وہ تو کانا پھوسی بھی کرتے تو دیوار کے پیچھے آواز پہنچ جاتی تھی۔ اس لیے سوچ ساچ کر انہوں نے یہ راستہ نکالا کہ اپنی آواز اپنے الفاظ اپنے عزائم اور اپنا پروگرام سب کچھ عوام میں لٹریچر کے ذریعے پہنچاؤ۔ بڑے منچلے لوگ تھے۔ دل۔ دماغ اور ذہنیت میں انقلابی جذبات اور باغیانہ روح پھونکنے کا اس سے بہتر کیا ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اس تمام عرصہ میں کئی بم کیس۔ گرفتاریاں۔ پھانسیاں بھی ہوئیں۔ ہندو مسلمانوں میں خوب جوتیوں میں دال بٹی" گاندھی بچارے مصلحت اندیشی اور پھونک پھونک کر قدم دھرنے کے قائل ہوتے ہوئے بھی کئی بار اپنے ہم وطنوں کو لے کر "آتش نمرود" میں کودے اور قید و قفس کی زنجیریں ہلائیں۔ اور ہر نوجوان ہر پہلی چیز کو سونا سمجھ کر روس کی کسوٹی پر پرکھتے رہے۔

آخر کار ملک میں چناؤ ہوئے اور پہلی بار کانگریس وزارتیں بنیں بظاہر کمیونسٹ بہت چراغ پا ہوئے انہوں نے اعلان کیا کہ

وزارت کی منزل ہماری نہیں ہے

اور اپنے مخالفین کو یقین دلایا "میری وحشت گریزاں ہے شبستان وزارت سے" لیکن سچ پوچھیے تو یہ زمانہ سب سے زیادہ ان کے لیے سازگار ثابت ہوا ہندوستان کی تمام دوسری پارٹیوں سے زیادہ کمیونسٹ ہی وزارتوں کی حیات ابدی کے لیے دست بدعا رہے۔ کیونکہ اسی زمانہ میں ان کی ادبی سرگرمیوں کو بڑھنے کا موقع ملا۔ انہیں دنوں ان کے اخبارات اور رسائل عالم وجود میں آئے۔ اسی وقت انہوں

نے سیاسی طور پر اہمیت حاصل کی اور اسی الجھاوے میں وہ سماج میں پھر آشامل ہوئے۔ عوام کا ایک بڑا طبقہ اب بھی بدظن اور غیر مطمئن تھا۔ لیکن اس گروہ کے کچھ نرم رو پالیسی والے کانگریس سے سمجھوتہ کر کے بائیں بازو میں شامل ہو گئے اور اس طرح چپکے سے کانگریس کے اندر بھی ایک بم رکھ دیا گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پہلے ہی بن چکی تھی لیکن کچھ کر کے دکھانے کا موقع اس کو ابھی ملا۔ شعراء میں جوش جیسے شعلہ بیان نے نئے ادیبوں کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا ساتھ ہی ابھرتے ہوئے جذبات کو حکومت کی پشت پناہی کی بدولت اظہار کا راستہ نظر آیا۔ کیونکہ اب تحریر و تقریر پر کوئی پابندی نہ تھی۔ روسی لٹریچر بھی ان دنوں بکثرت ہندوستان میں تقسیم ہوا۔ سوچنے کا طور طریق اور اظہار کا انداز بدل گیا۔

اردو ادب پر اب سیدھی چوٹ پڑ رہی تھی۔ نئے زاویے بن رہے تھے۔ نئی پگڈنڈیاں ہموار کی جا رہی تھیں۔ شعر و افسانہ جو ابھی تک ایک دوسرے سے بیگانہ تھے۔ انقلاب کی پکار میں گلے مل گئے۔ شعر کو زندگی کی ضرورت تسلیم کیا گیا اور "زندگی برائے ادب" یا "ادب برائے زندگی" پر بحث شروع ہو گئی۔

قدامت پسند چلا اٹھے کہ خدارا کیا کرتے ہو۔ شعر کی نرم و نازک زمین حقیقت اور کثافتوں کا اتنا بوجھ کیسے سنبھال سکے گی، نتیجہ یہ ہوگا کہ شعر اپنی "فردوس گوش" والی صلاحیت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

ترقی پسندوں کے پاس تو بس ایک ہی خواب تھا کہ اس وقت غلام ہندوستان کو نہ "جنت نگاہ" کی ضرورت ہے نہ موج کوثر و تسنیم کی بلکہ

"جو ممکن ہو تو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی"

ھ لیکن ۱۹۴۲ء کی "عوامی جنگ" والی غلطی سے کانگریسیوں کو چوکنا کر دیا اور انہوں نے چن چن کر ساری سرنگیں اپنے سمندر سے نکال پھینکیں۔

نئے ادب نے آسمان کی وسعت اور زمین کے پھیلاؤ پر نظر ڈالی۔ کھلی آنکھوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ قومی تباہی کے بنیادی عناصر دریافت کیے اور ادب کو ملک کی اقتصادی مشکلات، سماجی کشمکش، بھوک بیکاری اور جہالت جیسے مسائل سے نبٹنے کے لیے آلۂ حرب کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔

نئے لکھنے والے زبان و بیان کے الجھاوے میں بھی نہیں پھنسے۔ ساتھ ہی اس میں بھی شک نہیں کہ وہ خدمت کے شوق میں اعتدال کی حدود کو بھی تجاوز کر گئے۔ جس زندگی کو وہ جوش۔ حرارت اور عمل سے بھرپور دیکھنا چاہتے تھے اس پر کوئی پابندی انہوں نے لگانا پسند نہیں کی۔ حتّٰی کہ جو جی میں آئے کرو، جو منہ میں آئے کہہ ڈالو۔ بمصداق "خشتِ اول چو نہد معمار کج" پہلی سب اینٹیں تو اس پڑاوہ سے ایسی بھدی بے ہنگم نکلیں کہ طبیعت مکدّر ہو گئی وہ لوگ بھی

"نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور"

انقلابی شاعر اور ترقی پسند مصنف بن بیٹھے یا کوئی انتہائی لغو بیہودہ سا افسانہ لکھ کر اس پر ترقی پسندی کا لیبل چسپاں کر دیا۔ اور بقول ایک ادیب

"عوام میں عریاں کہانیوں کے ذریعے رذیل بھوک کی دکانداری کرنے لگے۔"

ایک صاحب جو اس ادبی تباہی پر بہت برہم تھے ایک روز کہنے لگے کہ بات یہ ہے کہ نئے ادب میں عورت کا ذکر بہت ہے۔ اقبال نے شاید انہیں سب کے بارے میں کہا ہے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

حالانکہ سچ پوچھیے تو ترقی پسندوں کے سر اس شعر کو تھوپ دینا بڑی ہٹ

دھرمی کی بات ہے۔ اس لحاظ سے تو نیا ادب بھرپور مرد ہے۔ اس میں عام آلات حرب نہیں کارزار حیات ہے۔ ہوس کی خون ریزیاں ہیں۔ مردانہ شقاوت ہے مثلاً کائنات کو نوچنے، پھاڑنے، تہ و بالا کر دینے کی آرزو ہے۔" نئے ادب نے "سر زیر بارِ منت درباں کیے ہوئے" پڑے رہنے والے عاشق کو وہی معشوق کی چوکھٹ پر سر پھوڑنے سے روک کر اس سے کہا کہ

مردِ سرکش تجھے آدم کی کہانی کی قسم
نوعِ انساں کے تقاضائے نہانی کی قسم
جذبۂ عیش کے ہر شورشِ فانی کی قسم
تجھکو اپنی اسی بدمست جوانی کی قسم
سر پھوڑ کے مر جانے کے بدلے اٹھ اور
دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

نئے رجحان نے نسوانی ہاتھوں سے تلوار لے کر جو وہاں بے مصرف پڑی رہا کرتی تھی، مرد کے مضبوط ہاتھوں میں تھما دی اور یہ بڑا کام تھا جو نئے ادب کے ہاتھوں ہو گیا۔ آج بھی مخالفین برہم ہیں کہ نئے شاعروں نے زبان کا ستیاناس کر ڈالا ہے۔ سارا کاٹ کباڑ لا کر انتہائی گنوارپن سے ڈرائنگ روم میں ڈھیر کر دیا ہے۔ لطیف ترین احساسات و جذبات کو جو شاعرانہ کنایہ کے بمشکل متحمل ہو سکتے تھے، چوراہے پہ لا کر ننگا کر دیا ہے۔ ادب برائے زندگی کے نام سے ثقیل تشبیہیں، بھدے استعارے اور نامانوس الفاظ رائج کر رہے ہیں۔ ان اسلوب بیان میں نہ کوئی ملاوٹ ہے۔ نہ ندرت مثلاً "مشرق کی تعریف سنیے۔

ایک ننگی نعش ہے بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی جبلوں کا لقمۂ خون، ملو لپٹی ہوئی

مشرق کی ایک دوسری تصویر بھی ملاحظہ ہو

وہم زائیدہ خداؤں کی روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں برسوں کا جذام

ایسی بہت سی گھناؤنی تشبیہیں تھیں جنھیں سن کر لفاست پسندی کو ابکائیاں آنے لگتی تھیں۔

اعتراض بیجا نہیں تھے۔ اس قسم کے اشعار میں کتنی ہی روشن حقیقت کیوں نہ ہو مگر فصاحت و بلاغت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ جو سخت اور متعفن الفاظ نثر میں لکھے جا سکتے تھے، جو بھیانک تصویر قلم سے کھینچی جا سکتی تھی اس کو بیکار شعر کے سر پہ سوار کر دیا گیا لیکن ذرا سنیے نیا ادب اس کا کیا جواب دیتا ہے۔

"مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن
ابھی ان کو غلام آباد میں میں گا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں ہے حسنِ جنت زار سے لیکن
ابھی دوزخ میں اس جنت سے دل بہلا نہیں سکتا
ابھی ہندوستان کو آتشیں نغمہ سنانے دو
ابھی چنگاریوں سے اک گل رنگین بنانے دو"

اور اس کا کوئی جواب معترضین کے پاس نہ تھا۔ ہماری سماجی اور سیاسی بیماریاں واقعی ایک سخت عمل جراحی کی منتظر تھیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ نئی رو نے بچاری غزل کی بھی لٹیا ڈبو دی عندلیب شادانی اور ان کے ہم نواؤں نے غزل اور غزل گو شعراء کو "رسوا سر بازارے" کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پیر مغاں نے بہتیرا کہا۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مگر نوجوانوں کی نظریں تو اور ہی سماں دیکھ رہی تھیں وہ دیکھ رہے تھے۔

آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے

اس لیے انھوں نے ادبی مینا و ساغر توڑ دیے اور پیری و کہنہ سالی کو للکارا۔

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں
ساغر و ساز نہ ہے جنگ کے نعرے ہیں یہاں
یہ دعائیں ہیں وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں
مائل جنگ نظر آتا ہے ہر پیر و جواں
سرفروشان ہلاکش کا سہارا بن جا
اٹھ اور افلاک بغاوت کا ستارا بن جا

اس نئی لہر میں حیات بخش عناصر کی کمی نہ تھی۔ اسی کی بدولت اردو ادب دنیائے ادب سے روشناس ہوا۔ زندگی کی حقیقتوں سے قریب تر ہونے کا یہ نتیجہ ہوا کہ صرف تفریح و تفنن کے بجائے سماجی اقتصادی اور بین الاقوامی مسائل بھی ادب کی جولانگاہ بن گئے۔ زاویۂ نظر بدلنے سے نظر میں وسعت پیدا ہوئی لکھنے والوں نے ہر صنف ادب کو مالا مال کرنا شروع کر دیا۔ مختصر افسانہ ڈرامہ اور ناول کے ساتھ ساتھ سیاسی اور علمی لٹریچر میں بھی اضافہ ہوا۔ ان کی تاریخی کوشش اور تنقیدی کاوشیں بھی تعریف کی مستحق ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ صوبائی اور مذہبی تعصب کو انہوں نے پس پشت ڈال دیا۔ یہ دور ایسا تھا

کہ سیاسی جماعتوں کی کشمکش نے ادب میں بھی فرقہ پرستی کا رجحان پیدا کر دیا تھا۔ نئے ادیب صرف ادیب تھے۔ انہوں نے ایک ایسا گروپ بنا لیا تھا جس تک فرقہ واریت کی ہوا نہ پہنچ سکتی تھی۔ لیکن اس حصار کے اندر اللہ میاں کو بھی گھسنے کی اجازت نہ تھی اور اس بزعم خود آمریت پر انہیں فخر تھا۔

ہندی۔ اردو۔ انگریزی، مرہٹی، بنگالی سب اس دیس کی زبانیں تھیں اور وہ ہر زبان کا ادب ایک دوسرے میں منتقل کرنے کی سعی کرتے تھے۔

ادھر شعرا کو انھوں نے ردیف، قافیہ، بحر، وزن سب کی قیدوں سے "سبک سر" کر دیا۔ کائنات کی وسعتیں پہلے بھی قلمروئے ادب کے زیر نگیں تھیں لیکن انسان کی نظر ادب و احترام کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اب شوخ اور گستاخ نگاہیں پڑنے لگیں۔ یہ واقعہ ہے کہ سمت و مقام کی قیدیں ہٹ کر اس کی حیثیت گم کردۂ راہ آوارہ گردکی ہو گئی۔ مثلاً ایک اسی طرح کی نظم ملاحظہ ہو

"سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ

رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے

جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے

اور اب رات کے سخت و سیہ سینے میں" وغیرہ وغیرہ

نوجوان ادیبوں نے دل کھول کر اس نظم کو سراہا۔ شاعر کے علوئے تخیل اور حقیقت نگاری کی داد دی۔ لیکن میری جیسی بہت سی بھونڈی عقلیں تھیں جن کے پلّے خاک نہ پڑا کہ یہ ہے کیا گورکھ دھندا؟ نوجوان دماغ شاید رات کے سخت و سیہ سینہ، تیتری کی کہسار پہ یلغار، دور مشرق کی کمیں گاہوں میں دھڑکتے ہوئے دل؛ جیسے الفاظ میں ایک جہان معنی پنہاں سمجھتے ہوں گے لیکن پھر بھی میرا دعویٰ ہے کہ دل پر تو رتی برابر ہوا لگی نہ ہو گی۔

بہرحال یہ دور ایسا تھا کہ زیادہ تر مغربی اہل قلم کا چربہ اتارا گیا۔ چوں کہ ابھی سیاسی اور ادبی شعور پختہ نہیں ہوا تھا، اس لیے بقول غالب

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

اس میں شک نہیں جدید ادب میں بہتیری چیزیں ایسی تھیں کہ دل میں اتر جائیں تو نکلنے کا نام نہ لیں لیکن بہت کچھ ایسا بھی تھا جسے دیکھ کر گھن آتی تھی۔

اب سوال یہ تھا کہ عوام اور اہل علم طبقہ زبان و بیان کا ماتم کرے یا انقلاب کی پکار سنے۔ ان تمام بھونڈی بے تکی چیزوں میں جہاں بادلوں کی گھن گرج تھی، موت کا رقص تھا۔ اہرمن و یزداں کی پکار تھی، خون کی دریاؤں سے بڑھ جانے والی روانی تھی اور طبیعت کو منغض کر دینے والی پستی تھی، وہاں جوانی کا جوش و خروش، ٹھوکروں سے قصر شاہی کو ڈھا دینے کا عزم، سرمایہ داری کو مٹا دینے کا ارمان اور ایک جدید نظام عالم بنانے کی تڑپ بھی موجود تھی۔ بھوک، بیکاری، گناہ اور ہوسناکیاں بھی ادب میں جلوہ گر تھیں اس حمام میں ہندوستان کا دکھ بیماری، سماج اور آرزوئیں سب برہنہ تھیں۔ نیم شعور اور لاشعور تک عریاں تھا بلکہ بعض وقت ان لوگوں کی کوئی ناول افسانہ یا شعر پڑھ کر ایسا لگتا تھا جیسے بیچ بازار میں اپنے کپڑے اتر گئے ہوں۔

یوں سمجھیے نیا ادب ہندوستان کی اٹھتی جوانی تھی۔ مست بے پروا، قید اور پابندیوں سے اکتائی ہوئی۔ جنون بغاوت سے بھرپور نہ دار و رسن سے خائف تھی نہ موت سے گھبراتی تھی۔ کفن بر دوش میدان کارزار میں کھڑی تھی اور دشمن سے سمجھوتے کا خیال تک قریب نہ پھٹکنے دیتی تھی۔ یہ نعرۂ مستانہ گلیوں

میں گونج اٹھا۔ سڑکوں اور ملوں کے مزدور گنگنا اٹھے اور اہل سخن اس تذبذب میں پڑ گئے کہ کیا کریں، وقت کی پکار سنیں یا کانوں میں انگلیاں دے لیں؟ عوام کے لیے جو آئینہ ان لوگوں نے تیار کیا تھا اس میں اپنا چہرہ اتنا بھیانک نظر آتا تھا کہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لیکن یہ بھی تو جی نہیں چاہتا تھا کہ طبیعت کا تکدر دور کرنے کے لیے اپنے بدصورت چہرے کے بدلے نقلی چہرہ لے کر گردن پر سجا لیا جائے۔ بھلا برا جیسا ہے اس میں شک نہیں اپنا ہے۔ بہت دنوں سے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے ان بربادیوں کا پتہ ہی نہ چلا۔ اب دیکھا ہے درستی کی کوشش ضرور کرنی پڑے گی۔ اپنی تہی دامانی کا رونا رونے کے بجائے گل بداماں بننے کی کوشش کرنی ہوگی جیب وگریبان میں وسعت پیدا کرنی ہی ہوگی۔

ایک ذرا سا اطمینان یہ بھی تھا کہ یہ حالت ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ کبھی کبھی ان سرپھروں کو بھی ہوش آئے گا اور جب بھلے دن آئیں گے تب زمانہ کا مضبوط ہاتھ آپ ہی ہیرے جواہرات چن کر خزانے میں ڈال دے گا۔ رہ گئے کنکر پتھر سو وہ رلنے کے لیے ہیں ہی۔ انہیں کون پوچھے گا۔

خود نئے ادیب بھی اس کو منزل مقصود نہیں سمجھتے تھے۔ وہ آپ ہی کہتے ہیں۔

رواں دواں بڑھے چلو ابھی نشان ملا نہیں ہے منزل حیات کا
ابھی پتہ چلا نہیں ہے سرّ کائنات کا
بڑھے چلو بڑھے چلو

مگر منزل حیات کی دریافت میں ابھی اور دیر ہونی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں روس کی شرکت نے نوجوان ادیبوں کے قدم ڈگمگا دیے اور وہ بھول گئے کہ انسانیت، امن اور محبت کے بغیر پنپ نہیں سکتی ہے زندگی کا رازِ خوں ریزی حل نہ کر سکے گی۔ اس دوران میں ادب کو بالکل پروپیگنڈے

کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ نظم ونثر پر اب ان کا پورا قبضہ تھا۔ سنجیدہ اور راسخ العقیدہ حضرات خاموش ہو چکے تھے۔ ادب برائے ادب کے پرستار اب خاموش تھے لیکن اس صورت حال نے خود ترقی پسندوں میں دو گروپ قائم کر دیے۔ ایک ادب برائے تبلیغ کے قائل تھے دوسرے ادب برائے زندگی کے۔

پانچ سات سال کا یہ زمانہ بڑی بے اعتدالیوں میں گزرا۔ ادبی حیثیت سے بھی کوئی خاص ترقی نہ ہو سکی۔ جنگ ختم ہوتے ہی امید ہوئی تھی کہ اب عوامی حکومت ہوگی۔ علم ادب میں بھی اضافہ ہوگا۔ ہندوستان کی تمام زبانیں مساوی حیثیت سے ترقی کر کے کسی نہ کسی وقت ایک دوسرے سے قریب آ جائیں گی مگر

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

اخلاقی گراوٹ جو دوران جنگ میں انتہا کو پہنچ چکی تھی، ایک بارگی وبائی بیماری کی طرح پھوٹ پڑی۔ ملک کے طول وعرض میں فسادات کی آندھیاں چلنے لگیں۔ ہر خوبصورت اور جاذب نظر چیز کو باد سموم اپنے ساتھ اڑا لے گئی۔ بستیوں میں خاک اڑنے لگی ایسے وقت میں قدامت پسندوں میں کوئی ہندو تھا کوئی مسلمان کوئی سکھ تھا کوئی عیسائی۔ کسی کو صرف ہندی بولنا آتی تھی اور کسی کو صرف اردو۔

اس مصیبت کے عالم میں لامحالہ ملک کی نظریں ایسے لوگوں کو تلاش کرنے لگیں، جو اس پست سطح سے بلند ہو چکے ہوں۔ انسانیت نے چیختے اور کراہتے ہوئے زندگی کی آخری امید بھری نظریں نوجوان ادیبوں کی طرف اٹھائیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان سہارا ڈھونڈھنے والی بے کسی اور ان مایوس نظروں کی کشش انہیں کھینچ ہی لائی۔ جلتے ہوئے مکانوں، خون بہتی ہوئی گلیوں اور

تڑپتی ہوئی لاشوں کے درمیان غور وفکر میں ڈوبے ہوئے چہرے بھی دکھائی دیے۔

ان تین سالوں میں یہ ادب ہی تھا جس نے انسانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ ماں بہنوں کے زخم کھول کھول کر ادیبوں نے اہل وطن کو دکھلائے۔ سسکتی ہوئی لاشیں اور بلکتے ہوئے بچے لے کر وہ خداوندان حکومت تک بھی پہنچے۔ انھوں نے درندوں کے غول میں سے انسانیت کو ڈھونڈھ نکالا اور نظم ونثر کے جادو سے امن ومحبت کی تعمیر میں مدد کی ہے۔ وہ ہندو تھے نہ مسلمان نہ سکھ اس لیے دل کھول کر انسان کو روئے۔ جی بھر کر انسان کی مدد کی اور حتی الامکان انسانیت کو مرنے سے بچا لیا۔

غیر جانب دارانہ نظر سے دیکھنے والا اندازہ کر سکتا ہے کہ ان تین برسوں میں ملک کے بکھرے ہوئے شیرازے کو مجتمع کرنے میں شعراء کے آنسو افسانہ نویسوں کی عکاسی اور جرنلسٹوں کا بے باک قلم کتنا معاون ثابت ہوا ہے۔

بڑی سخت چوٹ تھی اور بہت ہی بڑا نقصان تھا۔ اتنا بہت کچھ کھو کر شاید اب انھوں نے سیکھا ہے۔ اب ان کی آنکھیں صرف روس کی طرف نہیں لگی ہوئی ہیں۔ وہ ہر ملک سے پھول چنتے ہیں۔ مگر اب ان پھولوں سے اپنے گھر کو سجانے کی بھی انہیں فکر ہے۔ غیروں سے علم وادب کا اندوختہ اکٹھا کرتے اور اپنوں پر لا کر صرف کرتے ہیں۔ اب ان کے یہاں صرف تخریب نہیں تعمیری پہلو زیادہ روشن ہے میرا خیال ہے اب یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی ہے کہ ایک جگہ کا بیج دوسری سرزمین میں بویا جا سکتا ہے مگر اس کی دیکھ ریکھ اپنے ملک کی آب وہوا کو مدنظر رکھ کر کرنی پڑے گی۔

موجودہ صورت حال کسی حد تک تو ضرور اطمینان بخش ہے اور ممکن ہے یہ سب "نوید آمد فصل بہار" ہو۔ نئے ادب کی بے راہ روی درمیانہ روی کی طرف

مائل ہو چکی ہے۔ ماضی کی خوبصورتیوں کو وہ مٹا دینا نہیں چاہتے ہیں بلکہ آگے بڑھنے میں اس سے مدد لینے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں۔

ممکن ہے نئے ادب کا "ہرجائی پن" ہندی اردو کا قضیہ بھی چکا دے اور اردو ادب کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع مل جائے۔ فکر و سخن کے پرانے ٹھیکیدار اپنی انجمنوں کو نئی رو سے بچانے کی کوشش کرتے کرتے اس وقت سپر ڈالتے نظر آرہے ہیں۔ پہلے تو وہ کسی قیمت پر تیار نہ تھے کہ نئے لوگوں کو اندر گھسنے دیں مگر شاعری میں مصالحت کے انداز نمایاں ہیں لیکن نو وارد ابھی اعتدال پر آئے نہیں ہیں۔ ان کا ایک گروپ آج بھی ادب کو کمیونسٹ پارٹی کا جھنڈا بنا دینے پر تلا ہوا ہے۔ پوچھو کیا بغیر جھنڈے کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ گوریلا لڑائی تو بغیر جھنڈے ہی کے لڑی جاتی ہے اور بغیر پروپگنڈے کے بھی انقلاب آجایا کرتے ہیں۔

اقبال اور عورت

مشہور مقولہ ہے "شاعری دماغی تخیلات کی چمکتی ہوئی آنکھ ہے۔" لیکن اب سے پہلے اردو ادب سے پہلے اردو ادب پر ایک ایسا دور بھی گزر چکا ہے جب اس چمکتی ہوئی آنکھ پر سرمہ، مسی، زلف اور رخال کی سیاہ دھند ایسی چھا گئی تھی کہ بینائی کی طاقت ہی کھو بیٹھی تھی۔ اندرونی طور پر ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا جا رہا تھا کہ ایسا لگتا تھا دم ہی گھٹ جائے گا۔ ادھر میں چرکین، جرأت، رنگین اور جان صاحب جیسے شاعروں نے وہ گندگی بکھیر رکھی تھی کہ اہل صفا کو ناک اور دامن بچا کر ان گلیوں سے گزرنا پڑتا تھا۔

البتہ چند اہل نظر اس اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے تعلیم کا پرچار کر کے تہذیب و اخلاق کی بنیادوں کو سدھارنے کی کوشش کی۔ آزاد نے ظریفانہ پیرایہ میں سیاست اور تمدن کا سبق پڑھانا شروع کیا۔ غالب نے نظم و نثر کے جادو سے اردوئے معلیٰ کو بقائے دوام عطا کیا۔ حالی نے مسدس لکھ کر بگڑی کو بنانے کی کوشش کی۔ شبلی نے تاریخ کے ورق الٹ کر دکھائے اور حضرت اکبر نے بڈھی ساس کی طرح مارے طعنوں اور کچوکوں کے نئی پود کا کلیجہ چھلنی کر ڈالا۔ چن چن کر مغربی تہذیب کے عیب گنوائے۔ غرض

"فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ڈوبتی ناؤ کو بچانے کی کوشش اپنے اپنے ڈھنگ سے سب نے کی۔

ادھر گھروں کے اندر یہ حال تھا کہ بچوں کو سکھایا جاتا تھا "میں سو جاؤں یا مصطفےٰ کہتے کہتے" سو جایا کریں مگر بیداری کا نغمہ الوہیت رائج الوقت نہ تھا۔ قوم اسے بھول چکی تھی۔ جوانوں کی خوش مذاقی منتظر رہا کرتی تھی کہ کب کوئی فتنۂ عالم

زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

نظر آئے اور وہ دل و جگر کو تشتری میں رکھ کر نذر کر دیں۔

دوپہر کی تنہائیوں میں جب بزرگوں کے کانوں کا ڈر نہ رہتا تو دل پھینک صاحبزادہ لہک لہک کر گنگناتے۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

یا

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر
وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
پان کل کے لیے لگاتے جائیں
یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں

انحطاط، عیش پسندی اور جمود کے اس ماحول میں یکبارگی اقبال کا "ترانہ" اور "شکوہ" بم کی طرح ہمارے گھروں میں پھٹا دل دہل گئے۔ نوجوان تلملا اٹھے۔ بچے نیند کی ماتی آنکھیں ململاتے ہوئے اٹکڑالا پنے لگے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور بڈھوں نے آہ سرد بھر کر کہا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اقبال نے تصورِ جاناں میں مر مر کر جینے والوں کو جگا دیا۔ یہ انوکھی سی صدا سن کر نوجوان سوچ میں پڑ گئے۔ کہاں سرمۂ مسی، نالۂ فراق، آشیانوں کے تنکے، قبرستان کی خاک، کہاں یہ دعوت فکر و عمل۔ وہ سب تو عمر خیام کے فلسفۂ سکون کے شیدائی تھے۔

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیرِ قدمت ہزار جانست

اور کہاں یہ بانگ درا

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

یوں سمجھیے کہ غالب کا پرواز تخیّل، حالی کی فکر و سنجیدگی، میر کا درد، انیس کا حسن بیان، رومی کی معرفت اور سعدی کی حکمت سب کی سب اکٹھا ہو کر اقبال بن گئیں۔

زمانے نے اس "نوائے سوختہ در گلو" کو سنا۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہیں سمجھا مگر دل سب کے سینے میں دھڑکنے لگے۔ اور "بانگ درا" نے قافلہ میں آثار بیداری تو ضرور ہی پیدا کر دیے۔ اقبال ڈاکٹر تو کسی اور چیز کے تھے مگر نبض پر انگلیاں رکھنے کا سلیقہ تھا۔ بحرانی کیفیت کا اندازہ کرتے ہی انھوں نے سمجھایا۔

تعمیر نو سے ڈرنا طرز کہن پہ مرنا
منزل یہی کٹھن ہے قدموں کی زندگی میں

اور اس دشوار گذار منزل کو طے کرنے کے لیے آہنی عزم، حرکت اور عمل کی ضرورت ہے۔ لیکن بندۂ محکوم یہ سب اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب آزاد ہو۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

انھوں نے محسوس کیا کہ نصیحت اور طعنہ تشنیع سب بیکار ہے بندگی و بیچارگی کا خاتمہ اور قوت و طاقت کا حصول قوم کی سربلندی کے لیے ضروری ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ تقریریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اور ذوقِ یقیں بغیر خودی کے ممکن نہیں۔ کہتے ہیں "تعمیر خودی میں ہے خدائی"۔ لیکن کعبہ اور بت خانہ میں انہیں بیدار خودی نظر نہ آئی۔ تب "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" لکھ کر تفصیل سے انھوں نے مفہوم سمجھایا۔

اقبال نے ہمیں بتایا کہ جب خودی محبت کے اثر سے مغلوب ہو جاتی ہے تو اس کی قوت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سارے عالم پر محیط ہو سکتی ہے۔

ہزار چشمہ تری سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

اقبال اس اہم واقعہ کی یاد ہر وقت تازہ رکھنا چاہتے تھے۔ جب روز ازل کائنات کی ہر شے آدمؑ کے سامنے سر بسجود ہوئی تھی۔ جو ترقی اب تک انسان نے کی ہے اور کائنات کی جن جن چیزوں پر اسے تصرف ہوا ہے وہ سب ان کی نظر میں ابتدائی اور نامکمل ہیں۔ کہتے ہیں۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمّت مردانہ

بھلا دلی اور لکھنؤ والوں کی عصبیت ان کو کیوں چھوڑتی۔ ان کے کلام اور زبان سب پر اعتراضات کی بوچھار ہو گئی۔ مجھے یاد ہے بہت سال پہلے لکھنؤ میں چند عزیزوں کے سامنے اقبال کا ذکر ہو رہا تھا وہ لوگ برہم تھے کہ اس پنجابی نے زبان کو تباہ کر کے رکھ دیا مثلاً۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ سجدوں کا تڑپنا سب کے نزدیک خلافِ محاورہ تھا اور اس پر استادوں کی کوئی سند موجود نہ تھی، میرے محبوب ترین شعر پر اعتراض ہو رہا تھا اس لیے میں نے جل کر کہا قاتل کی تلوار کے نیچے آپ کے شعراء ہمیشہ مرغِ بسمل کی طرح لوٹتے رہے اور اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ دل و جگر کے ہزاروں ٹکڑے معشوق تلووں سے مسلتے رہے اور اس جھوٹ پر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ دل کا آئینہ ٹوٹنے یا سجدوں کے تڑپنے پر آپ کو اچنبھا کیوں ہو رہا ہے۔ نہ وہ تشبیہہ۔ قافیہ اور محاورہ ازل سے آئے تھے نہ یہ۔ وہ بھی اپنے زمانے کی پیداوار تھے اور شاعروں کی من گھڑت یہ بھی اس صدی کا عجوبہ سہی مگر اس نقار خانہ میں میری کسی نے نہ سنی۔ میں خود ہی ہدفِ ملامت بن گئی۔ موزوں طبع حضرات نے فی البدیہہ اس بحر میں شعر کہہ کر سنانے شروع کر دیے اور ایک صاحب نے ظریف لکھنوی کا یہ شعر

کبھی اے حسینۂ نازنین نظر آ مسہری ناز میں
کہ ہزاروں بوسے پھدک رہے ہیں مرے منہ کی دراز میں

سنا کر کہا اب کہیے اگر سجدوں کا تڑپنا درست ہے تو بوسوں کا پھدکنا بھی فصیح ماننا پڑے گا۔ یہ شور و غوغا بھی ہوتا رہا اور قوم میں ذہنی و روحانی بیداری بھی پیدا ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کی درد بھری لے نے بہت جلد "گوش حقیقت نیوش" پیدا کر لیے۔

جس ذہنی انقلاب کی دعوت انھوں نے دی۔ اس کی پہلی شرط اپنے آپ کو پہچاننا اور دوسری اونگھنے والے افیونی مذہب سے بیزاری تھی۔ انسانی تگ و دو اور انسانیت کی ہمہ گیری کی کوئی حد اقبال کے یہاں نہیں ہے معراج نبیؐ سے بھی یہی سبق لیتے ہیں سہ

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور اسی لیے ان کی خواہش تھی کہ آدمی یا تو اتنا پھیل جائے کہ ساری دنیا اس کے اندر سما سکے یا پھر وہ خود اس دریائے وحدت میں گم ہو جائے بھلا وہ بھی کوئی آدمی ہوا جسے

کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

دنیا ہر روز نت نئے رنگ بدلتی رہتی ہے لیکن خدا نقادوں کا بھلا کرے وہ شاعروں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ زمین ٹل جائے۔ آسمان جھک جائے۔ مگر شاعر قطب صاحب کی لاٹ بنا ہوا ایک ہی جگہ کھڑا رہے۔ خود اقبال سے بھی لوگوں کو یہی شکایت ہے۔ کچھ عمر کا تقاضا، کچھ حالات، کچھ مجبوریاں، کبھی کبھی سیاسی تبدیلیاں انسان کو مجبور کر دیتی ہیں اور اسے اپنا زاویۂ نظر بدلنا ہی پڑتا ہے۔ شاعر تو اور بھی ذکی الحس اور نازک مزاج ہوتا ہے اور پھر جب اس کا یہ نظریہ ہو کہ

ہے کبھی جان اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو ظاہر ہے اس پر عمل بھی کرتا ہوگا۔ اقبال کے کلام کا تضاد بہتوں کی طبیعت پر گراں گزرا۔ بہت جلد صرف "ہندوستان ہمارا" نہ رہا۔ چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" ہو گیا اور جلد ہی وہ دن بھی آ گیا کہ اقبال نے کہہ دیا۔

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

اور آخر کار انھوں نے اعلان کر ہی دیا" ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست" اور نہ جانے کیوں نظریہ ارتقا کے ماننے والے اس سے بیزار ہو گئے۔
اقبال کا "مردِ مومن" اب وہ آدم نہ تھا جس کی اولاد کو شیخ سعدی کہتے ہیں۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

نہ وہ نیٹشے کا "سپرمین" تھا جو صرف قہاری اور شمشیر خارا شگاف کے بل بوتے پر دنیا کی تسخیر کر سکتا ہے۔

بلکہ فقر بوذرؓ اور صدق سلمانی رکھنے والا ایک پکا مسلمان جس کے سینہ میں علی مرتضیٰؓ کا دل اور صدیقؓ کا سوز جس کی آواز میں بلال کی "نوائے جگر گداز" اور بازوؤں میں قہاری و جبروتی بھری ہوئی تھی۔ ملوکیت کے ساتھ فقر و استغناء بھی رکھتا ہے اس کی ہیبت سے پہاڑ لرزہ براندام ہو سکتے ہیں اس کی بے باکی و دلیری سے دشمنوں کا ہرزہ پانی ہو سکتا ہے۔

مرد مومن کی ندرت فکر اتنی بلند تھی کہ۔

سرود شعر و سیاست کتاب دین و ہنر
گہر ہیں اس کی نگہ میں تمام یک دانہ

وہ ہندی تھا نہ مشرقی۔ اس کے وجود، کردار اور سرافرازی کی بنیاد لا الہ الا اللہ پر قائم ہوئی۔

اتنا عظیم الشان کیرکٹر تخلیق کرنے کے بعد اقبال نے اسے شہبازی و شاہینی کا سبق پڑھایا اور اس سے "پان اسلامزم" کے نظریہ کی تکمیل کی امید وابستہ کی جسے جمال الدین افغانی ادھورا چھوڑ گئے تھے اور اسلام کے منتشر شیرازہ کو اپنے تخیل میں پھر سے ایک مرد مجاہد کی سرکردگی میں مجتمع ہوتے دیکھ لیا۔ کہتے ہیں۔

رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے ہے

اسی شیرازہ بندی سے توحید کے مرکزی نقطہ کے گرد وہ کائنات کی ابتدا اور انتہا وجود اور عدم کو رقص کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اسی لیے بشریت کو

انھوں نے اتنے وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔

اقبال مقام عقل سے تو بہ آسانی گزر گئے مگر مقام عشق پر پہنچتے ہی عوام کی آنکھ سے اوجھل ہونے لگے۔ یوں سمجھیے کہ ہمالیہ، ترانہ، نیا شوالہ ان کا عنفوان شباب تھا۔ شکوہ، شمع و شاعر، خضر راہ ان کی بھرپور جوانی۔ اسرار خودی جوانی کا ٹھیراؤ اور سنجیدگی تھی اور رشباب کے اتار کے دن پیام مشرق اور جاوید نامہ کے غور و فکر میں صرف ہوئے۔ بال جبریل اور ارمغان حجاز ٹھوس بڑھاپے کی مدبرانہ موشگافیاں تھیں، ملک کے مختلف طبقوں میں وہ جدا جدا حیثیت سے مقبول ہوئے۔ صوفیوں نے اہل دل اور اہل نظر کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا۔ اہل علم نے عالم و مفکر کی صورت میں انہیں پہچانا۔ جوانوں نے اقبال کی بانگ درا سے صرف دلوں کے تار ہی نہیں جسم کے تمام اعضا میں حرکت روانی اور گرمی محسوس کی۔ کسی کو شہبازی و شاہینی پسند آئی۔ کسی کو فقر و غنا۔ غرض ہر صاحب ذوق کو اس خوان نعمت پر اپنے پسند کی چیز نظر آئی۔ سوائے عورتوں کے۔ ان بیچاریوں سے حکیم مشرق صرف یہ پوچھ کر رہ گیا۔

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیِ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

جنگ طرابلس کے دنوں میں ایک بدوی لڑکی فاطمہ کی شہادت پر اقبال نے کہا تھا۔

فاطمہ تو آبروئے ملت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی

اور اس وقت بہتیری عورتوں کے دلوں میں خولہ و فاطمہ بننے کی آرزو

تھر تھرانے لگی تھی لیکن شاعر مشرق نے دوبارہ ایسے کڑے تیوروں سے گھورا کہ سٹی بٹی گم ہوگئی اور یہ شعر گھونسہ بن کر دل پر لگا۔ اپنی ذلت کا شاید اتنا شدید احساس کبھی نہ ہوا ہوگا جتنا یہ قطعہ پڑھ کر ہوا۔ یہ زریں گلوبند تو بس لعنت کا طوق ہی نظر آتا ہے۔

ایک بزرگ فرمانے لگے کہ بھئی یہ شکایت بیکار ہے۔ اقبال کی زندگی میں عورت کا کوئی دخل نہ تھا۔ وہ عشق، محبت اور شوق و ولولہ جو مرد کی زندگی میں عورت کا حصہ ہوتا ہے وہ سب کا سب بہت پہلے وہ بارگاہ رسالت میں نذر کر چکے تھے۔ اس لیے عورتوں کا صرف رسمی تذکرہ ان کے ہاں ملتا ہے۔

ایک دوسرے صاحب نے فرمایا درحقیقت اقبال کو اپنی زندگی میں کوئی ایسی عورت ملی ہی نہ ہوگی جسے دیکھ کر ان کی خودی پکار اٹھتی کہ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" اور اس لیے عورت کے کردار اور فطرت کے تمام پہلو ان کی نظر سے اوجھل رہے ورنہ شاید یوں دامن بچا کر گزر جانا ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔

کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اقبال کا فلسفیانہ سیاسی اور مذہبی غور و فکر اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ ان کو اتنی فرصت ہی نہ تھی جو افراد اور شخصیتوں کا جائزہ لیتے۔ ان کی نظریں تو عالم لاہوت پر جمی ہوئی تھیں۔ اس دنیا کے نوادر و عجائبات دیکھنے کی ان کو فرصت کب تھی۔ ان خوش فہمیوں کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ اٹھا کر دیکھیے تو ماضی اور حال کی بہت سی مشہور شخصیتوں سے آپ کا تعارف ہو جائے گا۔

انھوں نے لفظی مباحثے بھی کیے ہیں۔ شکایتیں اور مناجاتیں بھی کی ہیں۔ سیاسی فارمولے بھی پیش کیے ہیں۔ بین الاقوامی مسائل پر بھی بحث کی ہے لیکن ہر جگہ مرد ہی

سے مخاطب رہے ہیں۔

غضب ہے۔ کسی کی گود میں بلّی دیکھ کر بھی وہ بلّی کی مالکہ سے نہیں خود بلّی سے مخاطب ہو جاتے ہیں جیسے عورت اور بلّی میں کوئی فرق نہیں۔

عورت نظر کے سامنے آئی نہیں اور انھوں نے صدیوں پرانی عینک چڑھا لی۔

حسن کی تعریف کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔

ابدی بنتا ہے یہ عالم فانی جس سے
ایک افسانۂ رنگیں ہے جوانی جس سے
آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں
خاتم دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں

ذرا دیکھیے حسن و عشق کسی کو بھی عورت کے قریب نہیں آنے دیتے۔ وہ انسان سے ہر جگہ مخاطب رہے ہیں مگر انداز تخاطب میں کسی جگہ بھی ان سے اس معاملہ میں بھول چوک نہیں ہوتی ہے کہ انسانوں میں مرد عورت دونوں ہیں۔

اقبال نے اکبر کی طرح کبھی یہ مشورہ نہیں دیا کہ "زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ بساز" وہ اس "مرد مومن" کو لائے تھے جو زمانہ کو اپنے ساتھ لے چلے اور اگر زمانہ چلنے سے انکار کرے تو اس کی گردن مروڑ دے۔ کہتے ہیں

"زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز"

مگر یہی اقبال عورتوں کے لیے چاہتے تھے کہ مرد تو زمانے کو اپنے ساتھ لے چلے اور عورت ان دونوں کے ساتھ گھسٹتی ہوئی چلی آئے۔

بیشک وہ عورت کے سامنے ضرور سر جھکاتے نظر آتے ہیں جو ماں ہے اور

آتشیں لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ "خواہراں را اسوۂ حسنہ بتول"

مگر پھر بھی عورت بحیثیت عورت کے ان کے ہاں نظر نہیں آتی۔ نہ وہ کسی دلکشی کی حامل ہے۔ نہ مرد کی زندگی میں سوا جنم دینے کے اس کا دخل ہے۔ نہ زمین کے حسن و تزئین میں اس کا ہاتھ۔ نہ وہ چراغ خانہ ہے۔ نہ شمع انجمن۔ ایک وجود مستور ہے۔ جس کو صرف نصیحت کی جا سکتی ہے۔ اس کی بات نہیں سنی جا سکتی۔ اس پر اعتراض ہو سکتا ہے اور اس کی عزت بھی۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

---

[1] "جاوید نامہ میں" دلبری پر زمانۂ حاضر کی ایک عورت کی تقریر۔"

آدھ گھنٹہ بزمِ ادب میں

یہ بزم ادب ہے میرا ارادہ یہاں کوئی بے ادبی کرنے کا نہ تھا مگر اس سخن ظریفی کی داد نہ دوں تو خود اپنے ساتھ اور آپ سب کے ساتھ ناانصافی ہوگی یعنی آج حمیدیہ کالج کی اس بزم کا افتتاح جس کے ہاتھوں ہو رہا ہے اس نے کالج کیا کسی اسکول کی بھی کبھی شکل نہیں دیکھی۔

سنا کرتی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب علم پر جہلاء قابض ہو جائیں گے شکر کیجیے ابھی وہ دور نہیں آیا۔ اب رہی کرسی کی بات تو اس کے لیے کوالیفکیشن کی ضرورت نہ پہلے کبھی تھی۔ نہ اب ہے۔ نہ کبھی ہوئی۔ اگر تخت یا کرسی کے لیے علم و فضل کی ضرورت ہوتی تو خواجہ حافظؔ یہ رونا نہ روتے ؂

اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

غالبؔ کو بھی شکوہ تھا ؂

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

حالانکہ مرزا صاحب آج زندہ ہوتے تو شیوۂ اہل نظر کیا خود اہل نظر کا

ماتم کرتے۔ بہر حال اس جسارت کی نہ میں معافی مانگوں گی۔ نہ آپ افسوس کیجیے۔ کوئی بات نہیں۔

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

حضرات! آپ میں بہت سے ادیب و شاعر ہوں گے۔ بہتیرے سخن فہم و سخن شناس اور کچھ نووارداِن ادب بھی، جن کا بے اختیار دل چاہتا ہوگا کہ شاعر بنیں۔ ادیب کہلائیں۔ مصنف مشہور ہوں اور اگر یہ نہ ہو سکے تو لہو لگا کر شہیدوں میں تو ضرور ہی شامل ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں، بھلا وہ انسان ہی کیا جس میں سینس آف ہیومر نہ ہو یا جسے زندگی کی تلخیوں کو ہنس کھیل کر برداشت کرنا نہ آتا ہو۔ اگر اس کے پاس تخئیل اور حسن نظر نہیں ہے نہ سہی۔ الفاظ کو موزوں ڈھنگ سے برتنے اور اکھٹا کرنے کا سلیقہ بھی نہ ہو تو اسے حیوانِ ناطق کے سوا اور کیا کہیں گے۔ وہ بھی کیا آدمی ہوا جو کاغذ پر دو چار چھینٹے چھوڑ کر دنیا کو اپنی طرف متوجہ بھی نہ کر سکے کہ "مجھے دیکھو۔ مجھے پڑھو اور میری سنو"

ان دنوں یہ کچھ ایسا مشکل کام بھی نہیں ہے۔ اب وہ استادانِ فن بھی خاموش ہیں جو طرح طرح کی حد بندیاں قائم کر کے روک لگایا کرتے تھے۔ منچلوں کی اُپج اور زندگی کی دوڑ نے ساری فصیلیں توڑ کر جگہ جگہ چوراہے بنا دیے ہیں۔

ادب کی بات اب فکر و فن سے گزر کر فہرست جائزہ اور اعداد و شمار تک آ پہنچی ہے۔ اس لیے کوالٹی کا چرچا کم ہے اور ورائٹی پر توجہ زیادہ ہے۔ بیسیوں قسمیں ادب کی رائج ہیں۔ فلمی جاسوسی۔ تفریحی۔ سیاسی۔ ان میں سے کسی پر بھی آسانی کے ساتھ عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شعر و سخن کے ٹھیکیدار کہا کرتے تھے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا قوال! لیکن یہ مقولہ پچھلی صدی میں ہی غلط ثابت ہو گیا۔ جب لکھنؤ کے مرثیہ گو شعراء نے فن، فصاحت اور نزاکت شعری کی انتہائی بلندیوں کو چھو کر استادانِ

سخن کو محو حیرت کر دیا تھا۔ رہے قوال تو انہوں نے الگ اپنا اسکول قائم کر کے طنز و تعریض سے پیچھا چھڑا لیا۔ ان کی درد و اثر میں ڈوبی ہوئی تانیں اتنا موقع ہی نہیں دیتیں کہ فن کی کسوٹی پر ان کو پرکھا جائے۔ سو بھئی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ساری سرحدیں ٹوٹ پھوٹ کر ادب اور سیاست کے ڈانڈے اس بری طرح ایک دوسرے سے مل گئے ہیں کہ ان کا تجزیہ کرنا اور ان کی بلندی و اقتدار کا تعین کرنا ممکن ہو گیا ہے۔

مشہور فارسی شاعر صائب کو "تحسین ناشناس" اور سکوت سخن شناس" دونوں سے ڈر لگتا تھا۔ لیکن آج کا ادیب ڈرتا نہیں ہے۔ وہ بیدھڑک شعر کہتا ہے بے تکان ناول افسانہ اور مقالہ لکھتا ہے۔ خود چھپواتا ہے۔ خود سب کو سناتا ہے اور خود سمجھاتا بھی ہے۔ اگر پھر بھی موٹی عقل والے نہ سمجھ سکیں تو جل کر کہتا ہے ـــ

"اب بھی نہ سمجھو تو تم سے خدا سمجھے"

اخلاقاً آپ کا فرض ہے کہ اجنبی مہربان نے جو وی۔ پی پارسل بھیجا ہے اُس کو چھڑائیں اور دادِ سخن دیں۔ شیخ سعدیؒ نے ایک کھرکھری آواز والے کو قرآن شریف پڑھتے سنا تو پریشان ہو کر پوچھا:۔ میاں تم اتنے زور سے کیوں پڑھ رہے ہو۔ اس نے کہا میں خدا کے لیے پڑھتا ہوں۔

جھلا کر بولے:۔ از بہر خدا مخواں" خدا کے لیے مت پڑھو لیکن ان نام نہاد ادیبوں سے تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ خدا کے لیے نہ لکھو۔ نہ سناؤ بھلا بتایئے۔

ایسے کافر کا کیا کرے کوئی؟

حاضرین! پنڈت جواہر لال نہرو آنجہانی نے کسی جگہ لکھا ہے ـ" آج کا آئیڈیلزم کل کا ریلزم ہے "۔ یعنی آج کا نظریاتی تصور آنے والے کل کی حقیقت ہے۔ اور نہ جانے کیوں اس جملے کو پڑھتے ہی مجھے افلاطون کی ریاست سے لے کر سنگھاسن بتیسی، طلسم ہوشربا اور جاسوسی دنیا تک سب ہی کتابیں یاد آ جاتی ہیں۔ انسان

کی تمنائیں، اس کے ارمان آرزوئیں، ماحول اور تجربے میں لپٹی ہوئی جب نثر اور نثر کا پیکر اختیار کر کے اس صدی تک پہنچیں تو ہم نے ان کے بہت سے خوابوں کو حقیقت کا جامہ پہنے دیکھ لیا۔

پتھر اور لوہے کے زمانہ سے گزر کر جب دنیا پٹرول اور اٹامک دور میں داخل ہوئی تو آتشیں اسلحہ ایٹم بم۔ چاند چھو لینے کا قصہ بہت سی دیوانی آرزوئیں جیتی جاگتی تصویریں بن گئیں۔

وہ بھی ایک زمانہ تھا، جب افلاطون کا تصور خیال میں ایک ریاست تشکیل کر رہا تھا جب کالیداس، وکرماجیت کے لیے سنگھاسن بتیسی تیار کر رہے تھے۔ جب آج کے ایک گھنٹہ کا سفر لوگ مہینوں اور سالوں میں طے کرتے تھے۔ جب ایک آدمی کا سر توڑنے کے لیے گوپھن سے پتھر پھینکا جاتا تھا اور رتھ پر بیٹھ کر مہابھارت لڑی جاتی تھی۔ جب ملکہ چہرخ کے لشکر کی تباہی کے لیے جادو کا صرف ایک گولہ کافی ہوتا تھا، جو دشمن کو مع میدان جنگ کے تہس نہس کر دیتا تھا۔ لیکن انسان کے تخیل میں مستقبل کی تمام ایجادات کے خاکے تیار ہو رہے تھے۔ خیال میں کورو اور پانڈو وائیویان چلاتے تھے اور عمر وعیار دعا کے بعد منھ پر ہاتھ پھیر کر نوخیز دوشیزہ بنجاتا تھا۔ تخیل کی یہ پرواز آج واقعات اور حادثات کا روپ دھار رہی ہے۔ فانی بدایونی نے کسی موقع پر کہا تھا کہ "اگر کوئی بچہ باپ کے کاندھے پر چڑھ کر چھت کو چھو لے تو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کی بلندی میں اس کے باپ کا قد بھی شامل ہے۔"

اسی لیے قدیم و جدید کا موازنہ کرتے وقت یہ خیال ضرور آتا ہے کہ وہ بھی ادیب تھے، ان کا بھی اک دور تھا۔ ماحول سے اونچے ہو کر انہوں نے آرزوؤں اور تجربوں کی مدد سے مستقبل کا ایک خاکہ بنایا۔ تخیل کی پرواز اور موئے قلم سے اس خاکے میں ایسے موزوں اور ریختہ رنگ بھرے کہ صدیاں گزر جانے پر بھی آب و تاب

میں فرق نہیں آیا ہے۔ انہوں نے بوریے پر بیٹھ کر شعر کہے کتابیں لکھیں۔ مٹی کی ہنڈیا میں اپلوں کی آنچ پر کیمیا بنائی اور نرکل کی قلم سے لکھ کر اپنے تجربات و نظریے دنیا کے لیے چھوڑ گئے۔

علم و ادب کی کوئی راہ اچھوتی نہیں ہے۔ ماضی کو بار بار لوٹ کر دیکھنا پڑا۔ آگے بڑھنے کے لیے اپنا نصب العین بنانے کے لیے منزل کا تعین، راہ کی دشواریاں اور سارے نشیب و فراز تو دیکھنا ہی پڑیں گے۔ کیونکہ اس وقت ایک اہم سوال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ آخر ہم مستقبل کے لیے کیا چھوڑ رہے ہیں۔ سائنس، میڈیسن اور ٹیکنالوجی کا میں ذکر نہیں کر رہی ہوں۔ بات ہے شعر و ادب کی، معنی آفرینی اور پرواز تخیل کی۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا زمانہ ہو گیا۔ مگر زندگی برائے ادب کبھی تو نہیں بن سکتی۔ نہ ادب کو وقتی۔ ہنگامی اور تفریحی چیز بنا کر زندگی سے فرار کا رستہ ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

کہتے ہیں زبان عوام الناس بناتے ہیں اور شاعر اسے نوک پلک سے سنوارتے ہیں۔ لیکن اب ٹکسال بدل گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی کرتی ہوئی زبان لچکدار ہوتی ہے اور اس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ ہر خوبصورت لفظ کو اپنائے۔ لیکن ادب صرف الفاظ کی ہنرمندی نہیں ہے۔ اکثر گفتگو سادہ انداز بیان کی بدولت دل پذیر معلوم ہوتی ہے پھر بھی تخیل و تصور میں اگر جدت، تسلسل اور روانی نہ ہو تو گاڑی رک جاتی ہے۔

اگر احساس بھرپور ہو تو اظہار کا ڈھنگ آہی جاتا ہے بیشک ادیب چاہیں تو بہتے ہوئے دھارے کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۷ء کے کربناک ماحول میں یہ شاعر اور ادیب ہی تھے، جن کے غور و فکر میں ڈوبے ہوئے چہرے ابھرے، شاعروں نے داستانِ درد سنائی۔ افسانہ نگاروں نے واقعات کا تجزیہ کیا۔ ناول نویسوں نے واقعات سے نتائج اخذ کیے اور اپنے الفاظ میں ہندوستان اور پاکستان کی آہیں دلوں کی دھڑکنیں، بہتے آنسو، نفرت اور دشمنی کی گھناؤنی فضا، مظلوموں کی ہمدردی سب ہی کچھ سمو کر

دونوں ملکوں کو چونکنے، سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی تحریروں میں عزم بلند کا احساس تھا اور ملک و قوم کو گھسیٹ کر ہاتھ تھام کر اس منزلِ اعلیٰ تک پہنچانے کی آرزو تھی، جہاں ملک و مذہب کی تفریق نہیں ہے اور جہاں ساری مخلوق اللہ کا کنبہ یا سب انسان آدم کی اولاد ہیں۔ انہوں نے فرد اور سوسائٹی میں تال میل پیدا کیا اور دو ملکوں کو ادبی رشتہ میں منسلک کیا اور اس طرح نفرت کی آگ پر محبت کے پانی سے چھینٹے دیے۔ بہرحال اتنے برس لشتم پشتم گزار کر آج پھر ہندوستان اپنے مفکروں ادیبوں اور شاعروں سے کہتا ہے کہ

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے

انسانیت کا مستقبل، امن عالم کا دارو مدار، اقدارِ حیات کی امانت جن ہاتھوں میں ہے کیا وہ اپنا فرض ادا کرنے کی طاقت و صلاحیت رکھتے ہیں۔ ادیب کا تفکر اگر "آتشوں کے آبشار" "چیختے شعلے" اور "لرزتے آنسوؤں" میں غرق ہو گیا۔ اگر اس نے غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی خلش کو موت کی نیند سلا دیا۔ اگر الفاظ کے وزن، مقدار اور چمک، درد و تاثیر کی لے فنا ہو گئی تو بے روح، سسکتی، خاک و خون میں لتھڑی بچاری انسانیت کیا کرے گی۔

اگر ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس بلا کسی نظریہ اور احساس کے صرف جذبات و جوش کے گھوڑے پر سوار رہے تو پھر اتریں گے کیسے۔ کیوں کہ وہ پھر ہلکے پھلکے بھی تو نہ ہوں گے۔ ان کے اعصاب پر جلنا کی جاہلانہ عصبیت یا سیاست کی وقتی اور ہنگامی ضرورتیں سوار ہو جائیں گی۔ خود غرضی اور اقتدار کی بھوک زمین پر پاؤں بھی نہ ٹکنے دے گی اور کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کا ممبر ضرور بننا پڑے گا۔ ذہن و فکر کی تخلیقی صلاحیتیں جب نثر و نظم کی شکل اختیار کرتی ہیں تو واردات قلب سے لے کر

(۱) سو: موجودہ دور کے جاسوسی ناول ۔

سوسائٹی اور فرد کی ذہنی اور مزاجی کیفیت تک اس میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں "ہر زمانے کا ادب اپنے ماحول اور اپنے دور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔"

سوسائٹی بدلتی ہے۔ اس کے ساتھ افراد ان کی زبان ان کے سوچنے کا ڈھنگ اور ان کی ضرورتیں سب بدل جایا کرتی ہیں۔ نظریہ زندگی اور معیار بھی بدل جاتا ہے مگر اقدار حیات جوں کی توں رہتی ہیں۔ نفرت و تعصب کی آندھیاں بھی صداقت و محبت کا بال بیکا نہیں کر سکتیں۔

کہتے ہیں "خواجہ حافظ کو تاتاریوں کی یلغار کے دنوں میں ایک فوجی سپاہی نے پکڑ لیا اور قتل کرنے پر تیار ہو گیا۔ ایک امیر آدمی ادھر سے گزرا اس نے کہا: ارے اس غلام کو میرے ہاتھ سو (۱۰۰) اشرفیوں کے بدلے بیچ دو وہ تیار ہو گیا۔ مگر خواجہ نے کہا نہیں ہرگز نہ بیچنا۔ میری قیمت اس سے بہت زیادہ ہے۔ ذرا ہی دیر بعد ایک گھسیارہ گھانس کا گٹھا سر پر لیے گزرا۔ اس نے تاتاری کہا۔ یہ گھانس لے لو اپنے گھوڑے کو کھلانا اور اس بڈھے کو مجھے دیدو۔ خواجہ سے پھر نہ رہا گیا۔ بولے ہاں ضرور دیدو۔ میری قیمت اس سے بہت کم ہے۔ اس کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگا: تو دو رنگی باتیں کرتا ہے جب سو سو اشرفی مل رہی تھیں تب انکار کرا دیا اور اب کہتا ہے دیدو۔ اب تو میں تجھے ضرور قتل کر دوں گا۔"

اس مذاق لطیف کو بھلا سپاہی کیا سمجھتا۔ خواجہ قتل ہوئے یا زندہ رہے مگر شاعر کی انا، اس کی قدر و قیمت شناسی آج بھی زندہ ہے۔ البتہ یہ ڈر لگتا ہے، کہیں ہمارے دماغ تاتاری جیسے نہ ہو جائیں۔ یعنی ہم لطافت ذوق سے محروم ہو کر انتشار و پراگندگی سے سمجھوتہ نہ کر لیں۔ تو پھر "اے تازہ واردان بساط ہوائے دل" آپ کہاں پاؤں ٹکائیں گے، کونسی راہ اختیار کریں گے۔ تنقید کے پردے میں گڑے مردے اکھیڑیں گے یا صرف قدیم شعراء پر ریسرچ کریں گے یا حالات سے نپٹنے کی کوشش کریں گے

رزم اور بزم دونوں میں کس کا انتخاب کریں گے۔

بھلا خیال تو کیجیے، اس نعرہ لگاتی۔ دھینگا مشتی کرتی ہوئی بھیڑ کو اپنے ساتھ لے چلنا کوئی آسان کام ہے۔ ان کے آگے چلو تو وہ سیدھا راستہ نہ چلنے دیں۔ ساتھ ہو جاؤ تو اسی مرگ انبوہ میں مرنا بھی پڑے۔ کوئی کہے گا "تم بیکار میری خلافت کر رہے ہو" کوئی صاحب ادب کی ٹانگ توڑیں گے" "میری لات سو گئی" "ناک بھوں نہ چڑھائیے" سب کچھ سننا پڑے گا۔ اور ان سب سے دو دو ہاتھ کرنے ہوں گے۔ اس دور میں ادیب بننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ سیاست کی ہلاکت خیزیاں۔ جہالت و افلاس زبان و بیان کے جھگڑے، جنگ کے بادل اور موجودہ حالات کے کوڑے چار دن میں ادبیت کا ملمّع اتار دیں گے۔

اگر آپ نے ہمت و جرأت سے کام نہ لیا، دو ہی صورتیں ہیں، یا تو راہِ فرار اختیار کیجیے یا لڑنے پر تل جائیے۔ اپنے نصب العین پر مضبوطی سے جم کر جو لڑائی ہو اس میں ہار بھی جیت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اسی سے انسانیت کی فتح اور حق و صداقت کا بول بالا ہوتا ہے۔

ہے کوئی ہندوستان اور پاکستان میں ایسا سورما ادیب جو امن عالم اور فروغ انسانیت کے لیے یہ فرض انجام دے۔ کیا وہ اس خون اور بارود کی کیچڑ سے بنی نوع انسان کو بسلامت پار لے جانے کی ہمت کر سکتے ہیں۔ فکر و فن کی بلندیاں ابھی جھکی نہیں ہیں۔ دنیا جنگ کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ ہمارا اتنا بڑا ملک بھی اسی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ اس جلتی آگ پر محبت کے چھینٹے دینے والے وہی ہو سکتے ہیں جن کو سچائی عزیز ہوگی۔ جنہیں ہر خوبصورتی سے عشق ہے۔ جن کو رحم ہمدردی، ظلم اور تشدد کا فرق معلوم ہے کیا کوئی ایسی قدر مشترک موجود نہیں ہے۔ جو ٹوٹے دلوں کو جوڑ دے۔ کیا کہا جائے اس وقت تو "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیا پھر ہم بزدل بن جائیں۔ دوسروں کی مار کھائیں لیکن میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ بہادری، شہ زوری، اقتدار اور تفوق سب اچھی صفات ہیں مگر کچھ لوگ تو ایسے ہونے چاہییں جو غلطی پر ٹوک سکیں، بہادری کو ظلم سے دور رکھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں۔ میدان جنگ میں دل بڑھائیں۔ لیکن جنگ بند ہونے پر صلح صفائی کی باتیں کریں اور یہ ادیب و شاعر ہی ہو سکتے ہیں۔

اچھا صاحب خدا آپ کا بھلا کرے بڑے صبر و سکون سے آپ نے میری بے ادبیاں برداشت کی ہیں اس لیے میری دعا ہے، خدا آپ کو موسمی ادیب بننے اور فصلی شاعر کہلانے سے محفوظ رکھے اور اس کالج کی خوشنما خوبصورت صاحب دماغ پیداوار بنائے جن کے صرف عقل ہی نہیں۔ دل بھی ہو۔

غالب اپنے آئینے میں

غالب اور غالبیات اس صدی کے ادیبوں کا من بھاتا موضوع ہے۔ ان کے کلام سے لے کر زندگی تک اور سات پشت سے لے کر موجودہ رشتہ داروں بلکہ حقہ۔ خاصدان۔ ہوادار حویلی۔ حتیٰ کہ میاں بیوی کے تعلقات تک ہر چیز اور ہر بات آب زر سے لکھی جا چکی ہے۔ اس دریا کو کھنگالنے میں ہر ادیب ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ غالب کو خود ہی ایک اندیشہ تھا کہ

"شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن"

اور شاید اسی لیے انھوں نے اپنے کلام کو بھول بھلیاں بنانے کا کوئی جتن اٹھا نہیں رکھا۔ خود کہتے ہیں۔

گنجینۂ معانی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

ان دریائے معانی کی تلاش میں جن لوگوں نے پاتال کی سیر کی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ سمندر کی تہ میں کسی کو موتی ملتے ہیں اور کسی کو گھونگے۔ گھونسے۔

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

غالباً یہی وجہ تھی کہ بجنوری اور حسرت کے آئینے میں غالب کچھ اور نظر آئے

اور ڈاکٹر عبداللطیف کے آئینہ خانہ میں اور ہی شکل دکھائی دی۔ مالک رام نے دوسرا ہی عکس دیکھا اور ایک موٹے خانہ ساز آئینہ میں غالب کا جو روپ مجھے نظر آیا ہے وہ بھی ذرا آج دیکھ لیجیے۔

میرا دعویٰ ہے کہ غالب کا جو رخ میں نے دیکھا ہے وہ اچھوتا نہ سہی تو کچھ ایسا عام بھی نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سامعین ناک بھوں سکوڑ کر کہہ دیں یہ سب ان کہی اور ان ہوئی باتیں ہیں، حالانکہ بات تو وہی ہے جو ان کہی ہو اور تصویر تو اسی کو کہتے ہیں جو ان ہوئی ہو۔

تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ غالب مرزا نوشہ کے نام سے مشہور تھے لیکن جدید تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام ان کے اں باپ نے نہیں انّا ددا نے رکھا تھا بات یہ ہوئی کہ بچپن ہیں انہیں دولہا بننے کا بڑا شوق تھا۔ جب دیکھو سہرا باندھے دولھا بنے، بیاہ رچاتے جا رہے ہیں۔ انّا ددّا نے ہنسی ہنسی میں مرزا نوشہ کہنا شروع کر دیا اور غالب بننے سے پہلے نوشہ بن گئے۔ سب تذکروں ہیں صرف جوانی اور بڑھاپے کا حال ہے۔ لیکن بچپن کا کچھ حال ہی نہیں کھلتا۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ مرزا بچپن ہی سے عاشق مزاج تھے اور ذرا ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے گریبان تار تار کرنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں نیا کرتہ پہنا اور دھجیری جھیری کر ڈالا۔

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

ہوشیار اتنے تھے کہ

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

بچپن میں جس سے محبت ہوئی تھی بڑھاپے تک اسی کو نبھاتے رہے مگر معشوق بھی کچھ کم وضعدار نہ تھا۔ اس نے بھی آخر تک انداز میں فرق نہ آنے دیا۔

کہتے ہیں ؎

مجھے اس سے کیا توقع بزمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

مرزا پیدائشی شاعر تھے ایک روز گھر میں آگ لگ گئی۔ ننھے نوشہ نے بیساختہ کہا۔

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

بڑی لاابالی طبیعت پائی تھی اور بڑے ہوئے تو سیر سپاٹے کی عادت پڑ گئی۔ دلی کے گرد و نواح میں کیکر کے جنگل بہت تھے۔ پہر دن وہاں ٹہلتے رہتے جنگل کچھ ایسا جی کو بھا گیا تھا کہ گھر میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔ ایک روز دوستوں نے پکڑ کر ایک کمرہ میں مقید کر دیا اور کئی دن بند رکھا۔ جب کھلے تو یہ کہتے ہوئے پھر جنگل کا رخ کیا۔

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لت بڑھاپے تک نہ گئی۔ مرنے کے بعد بھی یہ حالت تھی ؎

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

یہ تو مورخوں اور سوانح نگاروں کی ستم ظریفی ہے کہ یہاں ان کا مزار بنا ہوا ہے جس پر سنتی ہوں کہ اب ایک صدی کے بعد کوئی قبہ بننے والا ہے اور ہر سال پڑھے لکھوں کا دنگل بھی یہاں ہونے لگا ہے۔ حالانکہ غالب خود کہتے ہیں۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

سچ تو یہ ہے کہ بڑے آدمیوں کی پہچان ہی یہ ہے۔ مریں کہیں دفن کہیں

[1] مزار بن گیا۔ اور بیگم حمیدہ سلطان کی سرکردگی میں ہر سال مزار کی گل پوشی بھی ہوتی ہے

ہوں اور برسی کہیں منائی جائے۔ زندگی میں گالیاں کھائیں اور مرنے کے بعد پھول مٹھائیاں۔

ویسے خیال خود غالب کا بھی یہی تھا کہ

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اب رہا یہ سوال کہ وہ کس طرح مرے۔ ان کے کلام سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ شاید سر پھوڑ کر انہوں نے جان دی تھی۔

"مر گیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ہے ہے

یہ بھی غلط ہے کہ وہ بلی ماران کی کسی حویلی میں رہا کرتے تھے ان کا قدیمی مکان تو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ جل گیا تھا۔ اس تباہی کے بعد وہ مے خانے میں رہنے لگے تھے جہاں شیخ صاحب بھی آیا جایا کرتے تھے اور ان کا ایک قدیمی دشمن واعظ بھی چھپ چھپا کر نصیحت کرنے پہنچا کرتا تھا۔ جب پیسہ پاس نہ رہا تو مرزا نے قرض لے کر کام چلانا شروع کر دیا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اور سچ مچ فاقہ مستی رنگ لائی۔ پیر مغاں نے ایک دن للکارا کہ حضرت یا تو دام دیجیے یا بوریا بستر اٹھائیے۔ جھگڑا بڑھا اور مرزا کو با دل ناخواستہ میکدہ چھوڑنا پڑا اڈلی پوٹلی سنبھالے وہاں سے نکلے اتنے میں ایک دوست مل گئے پوچھا مرزا کہاں چلے جواب دیا۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

باوجود اصرار کے مرزا کی خودداری نے گوارا نہ کیا کہ دوست کے گھر جائیں۔

مسجد کے حجرے میں چندے قیام کیا مگر بار بار کہتے تھے۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

کچھ ہی دنوں میں یہ حال ہو گیا۔

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

شیخ جی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ روز آتے اور کہتے مرزا اب اللہ سے لو لگاؤ۔ بہشت میں جگہ ملے گی۔ مرزا چڑ کر جواب دیتے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اس بے سر و سامانی میں در محبوب تک پہنچے اور اپنی داستان مصائب سنائی۔ اس وقت وہ اچھے موڈ میں تھا اس لیے اجازت دیدی کہ اچھا ہمارے دربان کے پاس پڑ رہا کرو۔ یہ سننا تھا کہ جیسے انھیں کونین کی دولت مل گئی۔ دوڑے ہوئے گئے اور اپنا بوریا بستر اٹھا لائے مگر خدا خوبرویوں کی تلوّن مزاجی کا بھلا کرے۔ ذرا سی دیر میں اس کی مت پلٹ گئی۔ یہ بے چارے فقیرانہ ساز و سامان لے کر پہنچے ہی تھے کہ اس نے بپھر کر کہا۔ یہ میں نے کب کہا تھا کہ تم یہاں دھنی دے دو۔ ابھی یہ بستر کھول ہی رہے تھے کہ عتاب نازل ہو گیا اور مایوس و محروم واپس آنا پڑا۔ کہتے ہیں۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

آخر کار انہوں نے ویرانہ میں "بے در و دیوار سا" ایک کچا مکان بنا لیا اور اس میں رہا نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی آجاتے تھے۔ ایک دربان نوکر رکھ لیا تھا۔ وہ بیچارہ در و دیوار پر اگی ہوئی گھاس چھیل کر بیچتا تھا اور اسی سے پیسہ کماتا

تھا۔ ایک پنتھ دو کاج ہو جایا کرتے تھے۔ گھر کی حالت یہ تھی۔

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

آگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

کسی مورخ نے بھی آج تک یہ نہ بتایا کہ مرزا کے محبوب کا نام کیا تھا۔ وہ مرد تھا یا عورت؟ یہ تو پتہ نہیں چلا مگر قیاس غالب ہے بلکہ واقعات شاہد ہیں کہ وہ ہمہ صفت موصوف تھا اور سنا ہے دنیا کے ابتدائی دور میں جنس انسانی دو قسموں میں منقسم بھی نہ تھی۔ یہ تو رفتہ رفتہ جیسے دنیا کے تمام حصے الگ ہوتے گئے انسانی جنس کی بھی قسموں پر قسمیں بنتی چلی گئیں ممکن ہے غالب کے زمانہ تک بھی کبھی کبھار ایسی ہستیاں پیدا ہو جاتی ہوں اور شاید یہی اگلے وقتوں کے شعراء اور اہل دل حضرات کے معشوق بنتے ہوں گے۔ بہرحال یہ تو یقینی ہے کہ غالب کے ایک نہیں بلکہ دو تین معشوق تھے۔ ایک کا نام خورشید جمال تھا۔ ثبوت یہ ہے ؎

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

اور دوسرے کا نام بھی ایک شعر میں موجود ہے ؎

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو
دیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

مرزا کے زمانے میں بڑے کلے ٹھلے کے معشوق ہوا کرتے تھے۔ گالیاں دینا، دھول دھپا کرنا، عاشقوں سے پیر دھلوانا اور پیر دبوانا ان کا عام شیوہ تھا۔ مرزا بیچارے بھی اسی مصیبت میں گرفتار تھے۔ خود کہتے ہیں ؎

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

وصول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

کہاں ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

یوں معشوق کی بدمزاجی کے تو ہزاروں قصّے مشہور ہیں مگر غالبؔ کا معشوق شاید سب سے زیادہ بدزبان اور تنک مزاج تھا۔ مرزا لاکھ سمجھاتے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

مگر وہ اس کان سنتا اس کان اڑا دیتا یا پھر بھولا نادان بن کر پوچھتا کیا؟ غالبؔ جل کر کہتے ؎

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

ایک دن جو غالبؔ پہنچے تو محترم یا محترمہ کسی پر بگڑ رہی تھیں۔ ان کی موجودگی اور آمد کو نظر انداز کر دیا اور بدستور خونخوار نظروں سے معتوب کو مورد قہر بنائے رکھا۔ غالبؔ کو کہاں تاب۔ بیتابانہ عرض کیا ؎

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

اس نے تیکھی نظریں ڈال کر پوچھا کیا؟ مرزا نے عرض کیا ؎

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

مگر وہ اللہ کا بندہ کنکھیوں ہی سے دیکھتا رہا۔ ہونٹوں پر زہر خند لگا ہوں

میں تیزی و تندی اور یہ سوال کہ بے محابا کیا ہوتا ہے۔ مرزا تڑپ گئے دست بستہ عرض کیا مگر میری طرف دیکھنے سے پہلے اتنا بتا دیجیے کہ ؎

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

مگر وہاں وہی تیکھی چتون رہی اور منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے رہے ناچار بیچارے یہ کہتے ہوئے اٹھ آئے۔

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

ایک صاحب علم و فضل اہل دل اور اہل دماغ آدمی اور اس پر یہ مصیبتیں کچھ غالبؔ ہی کا ظرف تھا کہ اس پر بھی پاس وضع نبھاتے رہے۔ اتنے ہی پر بس نہیں، محبوب شہ سوار بھی تھا۔ حوادث نامی گھوڑے پر سوار ہو کر کبھی کبھی مرزا کے گھر بھی آیا کرتا تھا۔ ایک دن جو اسی ادا سے تشریف آوری ہوئی تو گھوڑا منہ زور تو تھا ہی اس نے دولتیاں چلانی شروع کر دیں۔ غالبؔ ٹھہرے وضعدار مہذب آدمی صحن مکان میں یہ دھما چوکڑی انہیں بہت بری معلوم ہوئی ڈرتے ڈرتے اتنا کہا کہ میری جان تمہارے ناز اٹھانے کی طاقت تو مجھ میں ہے لیکن اس گھوڑے کی منہ زوریاں مجھ سے نہیں سہی جاتیں ؎

لگدکوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

فرہاد بے چارے کو تو جوئے شیر لانے کا کام سپرد ہوا تھا مرزا پر بھی اس سے کم مشکل نہیں پڑی جب ایک دن معشوق نے حکم دیا کہ چیونٹی کے انڈے پر سورۂ فاتحہ لکھ دو۔ حکم تھا نادرشاہی۔ بندگی و بے چارگی تعمیل کرتے ہی بنی۔ جی تو یہ چاہتا

تھا کہ نظارہ جمال کریں اور وہاں یہ اصرار کہ ابھی چند منٹ میں لکھ کر حاضر کرو۔ لکھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے ؎

کیا تنگ ہم ستم زدگان کا جہان ہے
جس میں ایک بیضۂ مور آسمان ہے
بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جایئے

لیکن انڈا نگوڑا فلک کج رفتار کا قائم مقام بن کر دیدار محبوب میں حارج ہی رہا۔
مرزا کے معشوق کی خاص ادا یہ تھی کہ ان کی شکل دیکھی اور وظیفہ نماز کی سوجھی یہ بیچارے پہروں منتظر رہتے کہ اب نظر اٹھائے، لب ہلیں، نگاہ غلط انداز ہی سہی۔ مگر ہماری طرف ہو تو جائے اور وہاں اطمینان سے تسبیح کے دانے گھمائے جا رہے ہیں۔ اس چالاکی پر غصہ کے بجائے انہیں پیار ہی آتا اور بہت ہی لطیف پیرایہ میں الٹے اس کی تعریف کرنے لگتے

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

نجانے اس کمبخت کی کیا عادت تھی کہ ان کو دیکھتے ہی خاموش بیٹھ کر مسکرانے لگتا۔ یہ جھلا اٹھتے کہ آخر یہ کیا ادا ہے کچھ منہ سے بولو سر سے کھیلو۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کیجے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

ان سب باتوں کا جواب جو ملتا ہو وہ تو کھلا نہیں ایسا لگتا ہے مرزا پی گئے بس اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

تعریف کی بات تو یہ ہے کہ ان کا محبت بھرا دل ان سب برائیوں میں بھی خوبیوں کا پہلو چن لیتا ہے۔ جب ان سب تکلیفوں سے تنگ آ کر انھوں نے چاہا کہ مر جائیں تو ظالم اس پر بھی راضی نہ ہوا،

وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کچھ بس نہیں چلا اس لیے آہیں بھرا کرتے تھے اور انھیں دنوں یہ سائنٹفک مسئلہ ان کی سمجھ میں آیا کہ پانی بھاپ بن کر کیسے اڑ جاتا ہے۔

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

اب یہ سوال ہے کہ غالب کچھ اور بھی کرتے تھے یا در محبوب کی ہیرا پھیری ہی کیا کرتے تھے۔ غالب جس دور کی پیداوار تھے اس زمانے میں شرفا کا کوئی پیشہ نہیں ہوا کرتا تھا مگر غالب جہاں ہر بات میں اپنے زمانے سے مختلف تھے یہ رسم بھی انھوں نے توڑ دی تھی۔ ان کے کلام سے ثابت ہے بہادر شاہ کی مصاحبت اور سلیمان جاہ کے مشیر خاص ہونے کے علاوہ انھوں نے کھیتی باڑی بھی کی ہے یقین نہ ہو تو خود ان کے منہ سے سن لیجیے ؎

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

قدرت کو جیسے ان سے خدا واسطہ کا بیر تھا۔ بجلیاں گھر اور کھیت دونوں جگہ منڈلایا کرتی تھیں۔ گھر میں چور بھی آیا کرتے تھے۔ ایک بار تو انھوں نے سارا گھر ہی صاف کر لیا تھا۔ دن دہاڑے آ کر سب چھین لے گئے۔ اگلے وقتوں میں نیند بے داموں نہیں ملا کرتی تھی یہ تو غدر کے بعد گہری نیند سونے کا رواج ہوا تھا جب اپنا کچھ نہیں رہ گیا تھا تو کس چیز کی حفاظت بیداری پر مجبور کرتی ادھر ۱۸۵۷ء سے پھر خدا

نیند اڑ سی گئی ہے۔ بہر حال یہ تو دوسرا ذکر نکل آیا۔ مذکور تھا چوری کا غالب کہتے ہیں۔

نہ لٹتا دن کو یوں تو رات کو کب بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

لیکن اس سے پہلے جب سب کچھ تھا تو یہ حال تھا ؎

لوں مانگ بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

جب کھیتی میں بھی منافع نہ ہوا تو مرزا نے دکانداری کی۔ چاندنی چوک کے نکڑ پر دیدۂ و دل بیچا کرتے تھے لیکن اس کاروبار میں بھی گھاٹا ہوا۔ بہت دنوں تک کوئی گاہک ہی نہ آیا۔ خود کہتے ہیں ؎

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں لیے ہوئے

یہ نہ سمجھیے مرزا کام کے آدمی نہ تھے۔ بے حد ذہین ذکی صاحب فہم و فراست مگر تقدیر کے ہیٹے تھے۔ عشق نے ایسا نکما کر دیا تھا کہ سونا چھوتے ہی مٹی ہو جاتا۔ اسی الٹ پھیر میں بڑھاپا آگیا۔ اب جہاں جاتے نانا ابا دادا ابا کہلاتے۔ لوگ ادب کرتے یا منہ پھیر کر چل دیتے بقول جوش

معشوق کہیں آپ بزرگ ہیں ہمارے
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

مگر مرزا بیچارے کی بدقسمتی کہ یہ دن انھوں نے دیکھ ہی لیا۔ سوچتے سوچتے ایک بات ذہن میں آئی کہ لاؤ مصوری سیکھ لوں۔ دوستوں نے مذاق اڑایا کہ اس عمر میں تصویر کشی سیکھنے کا کیا شوق چرایا ہے بولے ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

خیر صاحب انتہائی محنت سے بڑے میاں مصور بن کر در محبوب پر حاضر ہوئے یا تو سیدھے منہ بات کرنا گوارا نہ تھی یا ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ فرمائش ہوئی کہ ہماری ایک تصویر بنائیے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ یہاں تو یہ ارمان لے کر آئے ہی تھے۔ فوراً پنسل سنبھالی برش اور پیالیاں ٹھیک کیں اور تیار ہو بیٹھے۔ لیکن بدقسمتی یہاں بھی آڑے آئی، مرزا تصویر کھینچ نہ سکے۔ برش پھینک کر اور پیالیاں توڑ کر لرزہ براندام بھاگے اور ہمیشہ کے لیے مصوری سے توبہ کر لی۔ ذرا داستانِ مصیبت سُنیے۔

نقش ناز بت طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

پے در پے اتنی ناکامیاں ہوئیں اور ایسی مصیبتیں پڑیں کہ گھنٹوں بیٹھے عالم اور اسباب عالم پر غور کرتے رہتے رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ سارا عالم انہیں حلقۂ دام خیال نظر آنے لگا۔ کہتے ہیں۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیاء مرے آگے

اسی سلسلہ میں تصوف کی طرف رجحان ہو گیا ویسے بھی مرزا بلغمی مزاج کے آدمی تھے۔ خود ان کے کلام سے ثابت ہے۔

پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

اور عموماً بلغمی مزاج والوں کو تصوف سے خاصی دلچسپی ہوتی ہے بہر حال ان دنوں معشوق سے بھی ان بن تھی اور مرزا یہ کہہ کر اس کے دروازے سے چلے آئے تھے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

بہت دنوں تنا تنی رہی۔ دوستوں نے طعنہ بھی دیا کہ پرانی محبت بھلادی۔ شناساؤں نے کہا ارے بھئی مرزا کیا اب زندگی بھر کے لیے عہد جدائی باندھ لوگے۔ آہ سرد بھر کر بولے ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

بات یہ تھی کہ جب وہاں جاتے فوجداری ہو جاتی اور دل و مژگاں کی عدالت میں مقدمہ پیش ہو جاتا۔ جائے بغیر رہا بھی تو نہیں جاتا تھا جب بھی یاد ستاتی یہ کہتے ہوئے پہنچے۔

چشم دلال جنس رسوائی
دل خریدار ذوق خواری ہے

مقدمہ پیش ہوتا تو فیصلہ ہمیشہ ان کے خلاف ہوتا تھا۔ اللہ ہی جانے ایک جفا شعار کے ہاتھوں شرافت کی کیسی مٹی پلید ہوئی تھی کہ مرزا کو کہنا پڑا۔

دہن شیریں میں جا بیٹھے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

کچھ ایسی چوٹ دل پہ لگی تھی کہ اسی رنج میں غالب کعبہ شریف چل دیے، خود کہتے ہیں۔

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

رند مشربی کے تو ہزاروں قصے آپ نے سنے ہوں گے لیکن یہ کسی نے نہ بتایا کہ وہ متقی پرہیزگار بھی تھے، صوفی منش بھی تھے۔ بہر حال اس ترنگ میں جانے کو تو کعبہ چلے گئے مگر ان کی انوکھی وضع قطع گریباں چاک خاک بسر دیکھ کر وہاں

کسی نے توجہ نہ کی خانہ کعبہ کا دروازہ بند تھا یا تو ارادہ تھا ؎

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

گھر واپس پہنچے تو یہاں سیلاب آیا ہوا تھا۔ دل شکستہ تو تھے ہی ایک بے حسی سی طاری ہو گئی تھی۔ سیلاب نے جنگل والے مکان کو بھی زد میں لے لیا۔ مرزا کو اس تماشے میں بڑا لطف آیا۔ دیواریں پانی میں تیر رہی تھیں اور مرزا کہہ رہے تھے۔

نہ پوچھ بے خودی عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

اسی طرح گلی میں ایک فقیر صدا لگایا کرتا تھا جسے لوگ مجذوب کہتے تھے۔ مگر محلے کے بچے اس کی تواضع ہمیشہ پتھروں سے کرتے تھے۔ ایک دن مرزا ادھر سے گزر رہے تھے۔ فقیر کے سر پہ پتھر لگا اور وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ غالب نے ہنس کر کہا میاں از خود رفتگی کے معنی تو یہ تھے کہ اس پتھر سے تم اپنا سر خود پھوڑتے چونکہ ابھی اس منزل تک نہیں پہنچے ہو اس لیے ؎

ہے سنگ پہ براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

کوئی کہتا ہے غالب کو بیسنی روٹی پسند تھی۔ کوئی کہتا ہے آم مرغوب تھے۔ کوئی کہتا ہے شراب من بھاتی تھی لیکن ان میں سے کوئی حقیقت کے قریب نہ پہنچ سکا واقعہ یہ ہے کہ غالب روٹی چاول کھاتے ہی نہ تھے۔ شاہی زمانے میں وہ غم الفت کھایا کرتے تھے۔ جب غدر ہوا تو یہ مرغن غذا بھی قلعۂ معلّٰی کے ساتھ نایاب ہو گئی ناچار دلّی چھوڑنا پڑی۔ ان کا خود ہی بیان ہے۔

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا۔

لیکن اتنے مصائب اور فلسفیانہ سنک کے باوجود مرزا بڑے دل گردہ کے آدمی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جب دہلی میں بھگدڑ پڑی تو جس کا جدھر منہ اٹھا چل دیا مگر غالب برابر ڈٹے رہے۔ ہائے ہائے کرتے رہے۔ احباب پر سینہ کوبی کی جھیل گئے۔ مگر دہلی کی گلیاں نہ چھوڑیں۔ ایک دن بھگوڑے احباب میں سے ایک مل گئے اور صورت دیکھتے ہی نصیحت شروع کردی کہ کیا مُردوں کی طرح گھر میں پڑے ہو۔ اب یہاں کوئی تمہارا قدر دان ہے مجھے دیکھو کس ٹھاٹ سے وہاں رہا ہوں۔ یہ انگریز تمہارا دین ایمان سب لے لیں گے ورنہ کہیں بھاگ چلو۔ اس شریف گردی میں ہم لوگوں کا یہاں کہاں گزر ہوگا۔

مرزا نے کہا۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

مگر آخر کہاں تک آدمی بھوکوں تو مرنے سے رہا۔ دہلی سے نکلے تو مگر پھر گھوم پھر کر دہلی واپس آئے۔

مرزا کے ایک لڑکا بھی تھا۔ نور العین نام تھا مگر جہاں ہر طرح کی پریشانیاں گھیرے ہوئے تھیں اولاد بھی ایسی ملی۔ لنج اپاہج۔ خود ہی بتایا ہے۔

سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے
دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

یہ برخوردار جتنے دن زندہ رہے ان کی تیمارداری اور دیکھ بھال کرتے کرتے اور کبھی بیچارے عاجز آ گئے تھے۔ مگر اولاد کی محبت تو دیکھیے۔

لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ شاخ
تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی

اس جنگل کی باغبانی کرتے کرتے خیال آیا کہ برخوردار اگر جی گئے تو کہیں

ہماری طرح یہ بھی دل پھینک نہ نکلیں۔ ایک روز بیٹھ کر ان کو نصیحتیں بھی کیں اور کہا "دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو" مگر چند ہی روز بعد وہ چل بسے، نظم باقی رہ گئی۔

ترقی پسند کہتے ہیں مزدور کسان اور سرمایہ دار کا جھگڑا ہمارا پیدا کیا ہوا ہے اس سے پہلے کسی کی اس پر نظر ہی نہیں گئی تھی لیکن اس سے پہلے غالب کی حقیقت شناس نظروں نے مزدور کی بھوک اور سرمایہ دار کی توند سب کچھ دیکھ لی تھی۔ غالب کو احساس تھا۔

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستوں آئینہ خواب گراں شیریں

ان کو یہ بھی معلوم تھا مزدور کی پیٹھ پر کوبڑ نکل آتا ہے۔

فلک العرش ہجوم خم دوش مزدور
رشتۂ فیض ازل ساز طناب معمار

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا ترقی پسند شاعر تھے بس ان کو زمانہ ناسازگار ملا تھا اس لیے "مشاہدۂ ہستی" کی گفتگو بھی بادۂ ساغر کی دھار پر کیا کرتے تھے۔ اس صدی میں پیدا ہوتے تو جو کہتے ڈنکے کی چوٹ کہتے۔

بڑھاپے میں ذرا اونچا سننے لگے تھے تب تک کان میں لگانے والا آلہ نہیں ایجاد ہوا تھا اس لیے بے چارے معشوق ہی سے التجا کیا کرتے تھے۔

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات

غالب نے تیر مارے ہیں نہ نشتر، جو دیکھا وہ کہا۔ جو بیتی وہ سنایا۔ جو محسوس کیا وہ سب کو محسوس کرایا، نہ عطر کا قرابہ لنڈھایا۔ نہ گندہ نالے کا ڈھکنا اٹھایا۔ خوشبو آئی لانبا سانس لے لیا۔ بدبو ہوئی ناک پر رومال رکھ کر گزر گئے۔ موقع ملا کہکشاں سے بھی سرگوشیاں کر لیں۔ ورنہ ساری زندگی زمین پر ہی پاؤں جما کر چلتے رہے اور آپ بیتی جگ بیتی کہتے سنتے رہے۔ ـــــ اچھے خاصے بھلے آدمی تھے۔ اب میں ان کی کیا تعریف کروں۔ بیچارے اپنے زمانے کے بڑے آدمی وہ بھی تھے اس لیے ذرا دل کی بیماری ان کو بھی تھی جو اس صدی میں سب بڑے آدمیوں کو ہوا کرتی ہے۔ بس

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

وہ کون تھیں؟

وہ کون تھیں۔ کہاں کی تھیں۔ وہ کیسے اس اسپتال تک پہنچیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی بتاتا کہ وہ ایک بنیے کی لڑکی تھیں۔ کسی کا خیال تھا، تعلقدار صاحب کی گھریلوے پالک کنیز کی اولاد تھیں اور کچھ لوگ کہتے تھے، مشن والیوں نے کسی اسپتال سے لے کر پالا تھا۔ لیکن وہ خود قصبہ کے ایک رئیس کو اپنا خاص عزیز اور اس خاندان کو اپنے میکہ والا کہا کرتی تھیں۔ کچھ بھی ہو۔ وہ پڑھی لکھی تھیں میلاد شریف اس دھڑتے سے پڑھتی تھیں کہ محفل پر چھا جاتی تھیں۔ نماز ایک وقت کی نہ قضا ہوتی۔ نعت، منقبت، مرثیہ، قوالی ٹھمریاں اور کبھی سب ہی کچھ تو ان کو یاد تھے۔ اور ان سب پر مستزاد، دواؤں کے انگریزی نام، ان کے بنانے کی ترکیبیں اتنی ازبر تھیں کہ وہ ہمارے قصبہ کے اسپتال میں کمپوڈر بن کر آگئیں۔

میں نے پہلی بار ان کو اسپتال ہی میں دیکھا۔ خدانخواستہ بیمار کی حیثیت سے نہیں رنگ برنگی لال، پیلی، نیلی شیشیاں کھٹا کھٹ اٹھاتی رکھتی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگیں۔ اُن دنوں بھی وہ جوان تھیں۔ خوب گول مٹول سرخ و سپید۔

زیور سے آراستہ۔ فرشی پاجامہ کے ڈھیر بھر پائنچے، نیفے پر سنبھالے ہوئے چھما چھم کرتی ہوئی، دواؤں کی ایک میز سے دوسری میز تک دوڑ لگا رہی تھیں۔ کیا پھرتی تھی۔ چھلاوے کی طرح سارے کمرے میں پھر رہی تھیں۔ بڑی تیزی سے ٹبلٹ کھرل میں سفوف

بن رہی تھی۔ پھر شیشی میں چند بوندیں دواؤں کی ڈالیں۔ نلکی سے پانی ملایا سفوف کی پڑیاں بنائیں اور جھپا جھپ مریضوں کے نسخے بنا کر دے دیئے۔

اک بارگی ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ بوا نصیبن نے آگے بڑھ کر نسخہ تھما دیا۔ نام پڑھتے ہی وہ اچھل پڑیں۔ چیل کی طرح جھپٹ کر مجھے گود میں اٹھا لیا اور ایک ایک کو دکھانے لگیں۔ دیکھو دیکھو یہ میرے دیور کی بچی ہے۔ میرے دیور جو وکیل ہیں نا، انہیں کی۔ وہ دیوانہ وار مجھے چوم رہی تھیں۔ سب کو دکھا رہی تھیں اور میں سہم کر رو دینے کے قریب تھی اور تب ہی انہوں نے مجھے بتایا کہ میں تمہاری چچی ہوں اور پھر دواؤں کے ساتھ دو روپے اور مٹھائی بھی لے کر میں گھر لوٹی۔ راستے میں بوا نصیبن نے کہا کہ یہ تمہارے رمضان چچا کی بیوی تھیں۔ سارا شہران کا رشتہ دار تھا اور سارے ضلع میں ان کے سسرال والے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کسی کی بھانجی تھیں، کسی کی چچی۔ کتنی حسرت تھی انھیں اپنے سسرالی خاندان سے ملنے کی۔ مگر خدا بھلا کرے سسر صاحب کا۔ نام کے تعلقدار رہ گئے تھے۔ علاقہ پہلے ہی مہاجن نیلام کرا چکے تھے، مگر رئیسانہ اکڑ کا یہ حال تھا کہ جب رمضان چچا کی شادی کی خبر سنی تو بپھرتے ہوئے آئے۔ ہزاروں گالیاں بیٹے کو سنائیں۔ بہو کی شکل دیکھنے سے انکار کر دیا۔ اور صاحب زادے کو بیوی کی کمائی پر چھوڑ کر اپنے گاؤں سدھار گئے۔

کمائی بھی آخر کتنی تھی۔ چھوٹی بہن، ان کی دو بچیاں اور اُن کے بڑے بھائی پہلے ہی ان کی کمائی پر ٹانگ پسارے بیٹھے تھے۔ آخر چچی نصرت بچاری سب کو کہاں تک کھلاتیں۔ انہوں نے بہن کو اسپتال کے اسٹاف میں شامل کرا کر الگ کوارٹر دلا دیا۔ سارا کام خود کر دیتیں۔ مگر نام بہن کا رہتا۔ بھیا بچارے کھانا پکاتے سودا سلف لاتے۔ وہ رات میں اسی باورچی خانہ میں چارپائی ڈال کر پڑ رہتے۔ گرمیوں میں اسپتال کے گھنیرے درخت کی چھاؤں اور اس کی ٹھنڈی ہوا کام آجاتی

کیوں کہ کوارٹر میں کمرہ تو صرف ایک تھا اور رچی اب نئی نویلی دلہن تھیں۔ انھوں نے ایک بگڑے رئیس سے شادی کی تھی۔ دونوں کو یہ فکر تھی کہ اپنی اہمیت کا احساس ایک دوسرے کو کرائیں۔ میاں اپنے امیر اعزّا کے تذکرے، علاقے کی لاکھوں روپے کی آمدنی کا حال، دو مخلص بھائیوں کی داستانیں اُن کو سناتے اور رچی اپنی انگریزی دانی اور ایمان و تقدس کی دھونس جما کر اُن کو مرعوب کرتیں۔

سارے دیور، جیٹھ، نند اور دیورانیوں کے نام ان کو ازبر ہو گئے تھے۔ کیسی تمنّا ان کو تھی کہ سب سے ملیں۔ سارے اعزّا مارے ڈر کے کنارہ کش ہو گئے سوا دور کے رشتہ دار دو تعلیم یافتہ بھائیوں کے جنھوں نے اپنی محبت و دوستی کو ہمیشہ نبھایا۔ ان کی نئی دلہن کو تحائف بھیجے اور رمضانی بابا کی ہتک نہ ہونے دی۔

صبح ہوتے ہی وہ ہاتھ میں چھڑی لے کر باہر نکل جاتے۔ بیوی اسپتال چل دیتیں۔ دوپہر کے کھانے پر میاں بیوی سے کہتے "بھئی کیا کروں فرصت ہی نہیں ملتی۔ روز کوئی نہ کوئی علاقے کا کام نکل آتا ہے۔ آج بھائی کے کام سے لکھنؤ جانا پڑے گا۔ ان کے بچوں کو علی گڑھ میں روپیہ بھیجنا ہے۔ محبوب کا بچہ بیمار ہے۔ وغیرہ وغیرہ غرض سارا دن انہیں فکروں میں نکل جاتا ہے اور بیوی خوش ہو جاتیں ان کے لئے نہ صرف یہ فخر کافی تھا کہ میرا میاں اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے بغیر کسی کا کام ہی نہیں چلتا۔ کتنے پرخلوص اور سیدھے تھے دونوں اور ایک دوسرے پر کتنا یقین تھا انہیں۔ چاہے کتنا بڑا جھوٹ میاں بولیں، بیوی آمنا صدقنا کہتیں اور چاہے کتنی ہی بڑی حماقت کی حرکت بیوی کر گزرتیں، مگر ان کے دل پر میل نہ آتا۔ اپنے وکیل بھائی پر ان کو بہت فخر تھا۔ مالی اعتبار سے بھی وہی ان کے کفیل تھے۔ اس لیے اُن کا تذکرہ اکثر ہوتا تھا اور روزانہ شام کی نشست میں شرکت

بھی ضروری سمجھتے۔ ان دنوں مردانہ مکان کی محفلیں دوست احباب کے علاوہ مصاحبین کے بغیر بھی مکمل نہ ہوتی تھیں اور رمضان بابا ان محفلوں کی جان تھے کتنے محبت کرنے والے تھے وہ۔ چاہے جتنا ستاؤ، مذاق اڑاؤ۔ دھوکے اور تمسخر کا نشانہ بناؤ، برا ہرگز نہ مانتے۔ ان کی موجودگی، ان کی بیگم کا ذکر اور ان پر پھبتیاں، جیسے اس محفل کی جزو تھیں۔ لیکن ان مشترکہ دوستوں میں ایک خان صاحب بھی تھے۔ ان کو بس یہ فکر رہتی تھی کہ رمضان بابا نے گھر پر کیسا دن گزارا۔ کیسی رات گزری اور بیگم کا حلیہ کیا ہے۔ مہذب سوالات کا تو رمضان بابا جواب دے دیتے۔ مگر ان کی بیہودگیوں کے جواب میں فحش گالیوں کا دور چل پڑتا۔ اگرچہ اپنی پیدائشی لکنت کی وجہ سے جب تک وہ ایک گالی دیتے، خان کم بخت دس گالیاں بک چکا ہوتا۔ اس کے بات کرنے کا انداز بھی بازاری تھا۔

وہ پوچھتا "تمھاری بیوی سنا ہے گانا بہت اچھا گاتی ہے۔ کسی دن سنواؤ یار۔ ہو جائے اس محفل میں مجرا اور دیکھو اپنی سالی کو بھی لیتے آنا۔ سنا ہے وہ مجیرا بہت اچھا بجاتی ہیں۔" اور ظاہر ہے، اس کا جواب ایک شریف آدمی کیا دے سکتا ہے۔ ہاتھا پائی تک نوبت آجاتی۔

حالانکہ یہ سب اصلیت تھی۔ قصبہ کا اسپتال ان دنوں کلب ہو رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر شام کو راؤنڈ کر کے اپنے بنگلہ چلی جاتیں۔ ہر رو بصحت مریضہ اور اور ان کی تیمار دار بیبیاں سب کی سب نکل کر برآمدے میں آجاتیں بڑی اماں ڈھولک پر تھاپ دیتیں۔ بہن مجیرا بجاتیں۔ کانی دائی ٹھول ڈئی گھنٹی تھام لیتی اور گانے بجانے کی محفل جم جاتی۔

یہ گانے کی تعلیم انھیں کہاں سے ملی، کچھ پتہ نہیں۔ نہ انھوں نے کبھی بتایا۔ آواز پاٹ دار تھی۔ ڈھولک میں سارے بول اور سُر نکال لیتی تھیں اور گلے بازی

اور گنگری تو ایسی لیتی تھیں کہ گویّے شاگردی کریں۔ یہی وجہ تھی کہ ضلع کی تمام قدیم گھرانوں کی پردہ دار خواتین، جن کے لیے میلہ ٹھیلہ میں جانا ممنوع تھا، بیماری کے بہانے مہینوں اس اسپتال میں رہتیں، بلکہ بیماروں سے زیادہ یہاں تیمار داروں کا ہجوم رہتا۔

انہیں دنوں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا۔ اتوار کا دن تھا۔ آج میاں صبح ہی صبح اپنے بھائی کے گھر چلے گئے تھے۔ بڑی اماں کو بھی اسپتال نہ جانا تھا، اس لیے وہ ابھی بناؤ سنگار بھی نہ کر سکی تھیں۔ کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ بھیّا نے لپک کر دروازہ کھولا۔ آنے والا ٹنک ٹنک سے درست شیروانی پہنے بانکی ٹوپی لگائے کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ بھابی سے کہہ دو، تمھارے دیور محبوب علی آئے ہیں۔ گھبرا کر بھائی نے دروازہ بھیڑ دیا اور دیور کے آنے کی اطلاع پہنچائی۔

مشکل یہ ہوئی کہ بھیا نے بھی محبوب علی کو دیکھا نہ تھا۔ اس وقت تو اتنے چھوٹے قصبوں میں فوٹوگرافر بھی نہیں ہوتے تھے، ورنہ میاں تصویر ضرور منوا لاتے زبانی حلیہ تو انھوں نے بتا دیا تھا کہ لانبے ہیں، گورے چٹّے ہیں۔ بہت عمدہ کپڑے پہنتے ہیں۔ مگر پھر بھی شنیدہ کے بود مانند دیدہ ـــــ

بہر حال اس خبر سے بچی نصرت۔ بچاری کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بولائی بولائی پھرنے لگیں۔ اے اللہ میں اپنے دیور سے کیسے ملوں۔ اس وقت تو میاں بھی نہیں ہیں۔ ان کی کیسے خاطر کروں گی۔ دیور ایسا ننٹ کھٹ کہ اس نے پھر باہر سے پکارا "بھابی میں آجاؤں؟"

ارے بھیا خدا کے لیے ان کو روکو۔ صحن میں ایک پلنگ ڈال کر قالین بچھا دو اور لو یہ کرسی بھی پاس رکھ دو اور دیکھو میں کپڑے پہن کر بیٹھ جاؤں، تب بلانا۔

جلدی جلدی اودھے سیدھے گوٹے کناری کے کپڑے، زیور سب پہن کر اور دلہن کی طرح دونوں آنکھیں ہاتھوں سے ڈھک کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئیں اور بھیّا سے کہا اب بلا لو۔ اتنی دیر میں دیور چار پانچ بار کہہ چکا تھا "میں آتا ہوں۔ لو میں آتا ہوں۔"

اور آخر کار گھس پڑا۔ بھیّا نے کرسی کھسکائی۔ مگر اس نے روک دیا۔ اماں یہ کرسی ورسی ہٹاؤ۔ میں تو بھابی کے پاس بیٹھوں گا اور زانوں سے زانو بھڑا کر بیٹھ گیا۔ اوہو، بھابی ذرا چاند سا مکھڑا تو دکھاؤ۔ افوہ کتنی شرمیلی ہو۔ یہ کہتے ہوتے ہاتھ ہٹا کر اس نے منہ دیکھا اور پھر جو خدائی خوار نے بکواس شروع کی ہے تو نہ پوچھو۔

اوہو کیا رنگ روپ ہے۔ کتنے پیارے ملائم ہاتھ ہیں کتنے سرخ گال ہیں اس کم بخت رمضان کی قسمت تو دیکھو کیا گلاب جیسی بیوی ملی ہے۔ بھابی کیا ہے، یہ تو چکوتری ہے چکوتری۔ وہ بندر بھلا کیا جانے ادرک کی لذت۔

چچی گھبرا اٹھیں کہ یا اللہ یہ کس قسم کا دیور ہے کہ اپنے بھائی کو بھی گالیاں دے رہا ہے ابھی وہ یہ سب فضولیات بک رہا تھا اور عامیانہ انداز میں تعریفیں کر ہی رہا تھا کہ چچا رمضان گھر میں داخل ہوئے اور بڑے زور سے چلاّئے۔ "حرام زادہ۔ مردود تو یہاں کیسے آگیا؟"

ان کی غصّے بھری آواز سنتے ہی چچی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور میاں کو غصّے میں چھڑی لیے دوڑتے دیکھا تو اٹھ کر بھاگیں۔ دیور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ مگر تب تک میاں قریب پہنچ چکے تھے اور اس پر پل پڑے تھے۔ ادھر دیور پٹ رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا "بھابی بچاؤ۔ بھابی بچاؤ" ادھر میاں کے منہ سے گالیوں کا آبشار ابل رہا تھا۔ بیوی کمرے میں بھاگیں تو وہ بھی ان کے

پیچھے بھاگا کیونکہ باہر نکلنے کا راستہ ایک ہی تھا اور اسی طرف مار پڑ رہی تھی۔

اب تینوں کمرے میں تھے۔ چچا رمضان مار رہے تھے۔ فحش گالیاں دے رہے تھے۔ وہ چوٹیں بچاتا جاتا تھا۔ بھابی کو مدد کے لیے پکارتا تھا۔ ہنس کر توبہ توبہ کرتا۔ معافی مانگتا۔ یہ بھی کہتا کہ اب پھر کبھی نہ آؤں گا اور بھابی کی تعریف بھی کرتا جاتا تھا۔ آخر کار اُسے بچ نکلنے کا راستہ مل گیا اور چچا بیوی پر برس پڑے۔ کوئی بھی دروازے پر آکر کہے 'میں تمہارا دیور ہوں اور تم اندر بلا لیتی ہو۔ وہ بچاری رو کر بولیں، اُس نے اپنا نام محبوب علی بتایا تھا۔ چلا کر بولے۔ لاحول ولا قوۃ یہ محبوب علی ہے۔ لعنت ہے اس پر۔ یہ تو وہ لفنگا شہدہ خاں صاحب ہے۔ دیکھو میں جاکر اس کو کیسا ٹھیک کرتا ہوں۔ محبوب کے سامنے ہی اس کی ٹھکائی کروں گا۔

شام کی محفل میں ایک شاندار جنگ، خان اور چچا میں ہوئی۔ یاران محفل دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک نے خاں کو لعنت ملامت کی اور دوسرے گروہ نے مزہ لے لے کر بیگم کا حلیہ اور روداد سنی۔ اتنا ہی نہیں خاں صاحب تو ایسے چھچھورے ثابت ہوئے کہ اس واقعہ کو ریوڑیوں کی طرح سارے شہر میں بانٹ آئے اور راستہ چلنے والے چچا کو روک کر پوچھتے۔ صفائی دیتے دیتے بچارے کی جان عذاب میں آگئی۔

انھیں شادیوں میں شرکت کا بڑا شوق تھا۔ بڑھاپے میں یہ شوق اس لیے زیادہ بڑھ گیا تھا کہ سروس سے ریٹائرڈ ہو کر گھر پر رہ رہی تھیں۔ بال بچہ کوئی تھا نہیں۔ ایک عزیز کے گھر بیٹی کی شادی تھی۔ میراثنیں گا رہی تھیں۔ مہمان سواریوں سے اتر رہے تھے اور گھر کے منتظمین، خاطرداریوں میں مصروف تھے۔ دلہن کے کمرے میں ہنسی قہقہوں کا بازار گرم تھا۔ یکبارگی ایک

لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔ سانس پھولا ہوا اور ہنسی روکنے کی کوشش میں چہرہ سرخ۔ اس نے پکار کر کہا چلو لڑکیو دلہن دیکھو، نئی نویلی دلہن۔

ایک: کون سی دلہن؟

دوسری: تم جاؤ۔ دیکھو، تم نے کبھی دلہن دیکھی نہیں ہے۔

آنے والی لڑکی نے جھلا کر ہاتھوں کو جھٹکا۔ "اچھا نہ دیکھو۔ چچی نصرت ڈولی سے اتری ہیں۔ اس وقت نہ دیکھا تو پچھتاؤ گی۔"

"چچی نصرت! ارے اللہ وہ آگئیں۔ اور یہ کہتی ہوئی لڑکیاں سب کی سب اٹھ کر دوڑ پڑیں۔ آنے والی نے ابھی صحن پار بھی نہ کیا تھا کہ دھڑا دھڑ گلے ملنے لگیں۔ "میری بھتیجی۔ میری بچی۔ میری نند۔ میری دیورانی" کہہ کہہ کر وہ کسی کو سینے سے لگا رہی تھیں۔ کسی کو پیار کر رہی تھیں۔ اور لڑکیاں تھیں اور لڑکیاں تھیں کہ گلے لگ کر الگ ہوتیں اور ہنسی روکنے کے لیے دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیتیں۔ سارے گھر میں دھوم مچ گئی 'چچی آگئیں'، سارے گھر کو ایک کھلونا ہاتھ آگیا۔ میراثنوں نے گانا بند کر دیا۔ اور حیران ہو کر دیکھنے لگیں۔

سرخ و سپید رنگ۔ بھدا بھدا نقشہ۔ گول چہرہ۔ دوہرا بدن۔ چھوٹا قد۔ نقلی دانت، مگر بالکل موتیوں کی طرح جڑے ہوئے کانوں میں بالی پتہ۔ تیز گلابی رنگ کا ریشم کا لچکا ٹکا دوپٹہ۔ دوسرے رنگ کی گوٹ کا بیل بوٹے والا فرشی پاجامہ۔ پیروں میں چھپڑے چھاگل پہنے۔ چھم چھم کرتی چچی، جٹھانی، دیورانی سب کو جھک جھک کر سلام کر رہی تھیں۔

ایک لڑکی نے پیچھے سے کہا۔

"پائے یار نے محشر مچا دیا۔"

دوسری ٹھوکا دے کر بولی۔

"نام اُن کا آگیا کہیں ہنگام بازپرس
ہم تھے کہ اُٹھ گئے صفِ محشر لیے ہوئے"

تیسری سامنے آکر بولی ، "بڑی اماں ایک پیارا شعر یاد آگیا۔

رخ روشن کی جھرّی ، حسن کا گویا ٹھٹھر جانا
قیامت ہے کسی معشوق کا سِن سے اُتر جانا

اور چچی نے زوردار قہقہہ لگا کر زانو پیٹ لیے ۔" اوہو ہو۔ کیا کہنا۔ کسی معشوق کا سن سے اتر جانا۔ خوب کہا۔" تھوڑی ہی دیر بعد چچی کے آگے چائے اور پلیٹ بھر مٹھائی لاکر رکھی گئی۔ ایک لڑکی سموسوں کی پلیٹ لے کر آگئی۔ دوسری نے جھپٹ کر ہاتھ سے چھین لی۔" پاگل ہوئی ہو؟ چچی کو نمک کھلاؤ گی ۔ نان ختائیاں لاؤ۔"

مل ملاکر کھا پی کر، اپنی پوٹلی اور بکس اطمینان سے رکھ کر، چچی نے ڈھولک سنبھال لی اور گانا شروع کردیا۔ ان کی ہر گٹکری پر واہ واکے ڈونگڑے برستے اور آخر کار جب کافی دیر اس ہو حق میں ہوگئی تو گھر کی بزرگ بیوی نے لڑکیوں کو ڈانٹا کہ "بس بہت ہو چکا۔ مایوں میں لڑکی اکیلی پڑی ہے اور تم سب یہاں اکٹھی ہو۔ جاؤ بھاگو یہاں سے۔ چچی کا پنڈ چھوڑو۔"

شادی میں وہ کئی دن پہلے سے آتیں اور ہفتوں مہینوں قیام کرتیں. سب کو یہ فکر تھی کہ کل وہ کون سا جوڑا پہنیں گی ۔ جوڑا بنا ۔ سُرخ سلیم شاہی جوتی بھی خرید کر آئی اور خوب مٹھائیاں بھی ان کو کھلائی گئیں۔

لڑکیوں نے آپس میں مشورہ کیا اور معصوم صورت بنا کر ان کے پاس پہنچیں " اللہ ! چچی کل چوتھی کی رسم ہونی ہے۔ دولہا کے پاس بزرگوں میں کسی کو تو بیٹھنا چاہیے۔ کیا آپ کے لیے ہم لوگ ایک مونڈھا نہ رکھ دیں۔ کرسیاں

تو ساری دعوت کے لیے اُٹھ گئی ہیں۔

چچی نے خوش ہو کر کہا۔" ضرور مونڈھا بچھا دینا۔ میں اپنے داماد کے سامنے بیٹھوں گی۔"

لیجیے صاحب مونڈھا سجا دیا گیا۔ اور چمکتی ہوئی زرتار جھول دیکھ کر وہ نہال ہوگئیں۔ دولہا اندر آیا اور دو چار لڑکیاں ٹھیلتی ہوئی چچی کو لے کر آئیں۔ "میرا داماد" کہہ کر انھوں نے چٹ چٹ دولہا کی بلائیں لیں اور غڑاپ سے مونڈھے میں سماگئیں۔ ظالم لڑکیوں نے مونڈھا الٹا رکھ کر اس پر کپڑا ڈال دیا تھا۔ بھاری جسم اور چھوٹا قد۔ پوری کی پوری اندر سما گئیں۔ دونوں ہاتھ اور پیر باہر نکالے ہوئے زور لگا رہی تھیں اور وہ سب کھڑی ہنس رہی تھیں، کوئی مدد کو بھی نہ آیا۔ دولہا نے منہ پر رومال رکھ کر ہنسنا شروع کر دیا۔ دو تین بڑی عمر کی عورتیں دوڑ پڑیں۔ کھینچ کھانچ کر انھیں نکالا۔ لڑکیوں کو صلواتیں سنائیں۔ لعنت ملامت کی۔

دو تین دن تک چچی کا بھی منہ پھولا رہا۔ مٹھائی کھلا کھلا کر بڑی مشکل سے منایا گیا۔ اُنہیں کپڑے اور زیور کے علاوہ دو ہی چیزوں کا شوق تھا۔ مٹھائی اور لیمو۔ اور یہ شوق بڑھاپے میں اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ جب بھی آتیں لیمو اور شکر ساتھ لاتیں۔ تشتری میں ذرا سی شکر نکالی، اس پر ایک لیمو نچوڑا اور مزے لے کر چاٹنا شروع کر دیا۔ یہ شغل دن میں کئی بار ہوتا۔ لیموں گالوں پر بھی رگڑتی تھیں اور کہتیں" اس سے رنگ جلتا نہیں" اور واقعی بڑھاپے تک اُن کی رنگت میں وہی آب و تاب تھی۔ ویسے ان کے آتے ہی مٹھائی کا انتظام لڑکیاں لڑکے جو دیور یا بھتیجے ہوتے تھے اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ کھاتے بھی اور کھلاتے بھی۔

ایک دن میٹھا کوئی پاس نہ تھا۔ صبح سے پریشان تھیں۔ اتنے میں ایک چھوٹا سا دیور جو ابھی اسکول میں پڑھتا تھا، آکر کہنے لگا "بھابی میں بازار جا رہا ہوں۔ کچھ منگوانا ہو تو بتا دیجیے۔"

بیتاب ہو کر بولیں "خدا تمہیں زندہ رکھے میرے اچھے دیور۔ بس میرے لیے دو لڈو لیتے آنا۔"

دیور بھی پرلے درجے کا بدتمیز تھا۔ کہنے لگا "ضرور لاؤں گا۔ اتنا بتا دیجیے کتنے بڑے ہوں۔ ذرا اپنے منہ کی ناپ دیدیجیے۔"

غصّہ آنے والی بات ہی تھی۔ ٹانگ برابر چھوکرا، وہ بھی مذاق کرنے لگا اور اس وقت واقعی وہ بہت خفا ہو گئیں۔ انھیں غصہ بہت کم آتا تھا اور آجائے تو منتے دیر بھی نہ لگتی تھی۔

بڑھاپے میں تہجد، اشراق اور رمضان کے علاوہ بھی روزے رکھنے لگی تھیں۔ اکثر رمضان کے مہینے میں آجاتیں اور ان دنوں بڑی چہل پہل رہتی۔ سحر کے وقت سے قوالی اور بھجن شروع ہوتے تو فجر تک جاری رہتے۔ ہاتھوں کی جھرّیاں، پیروں کی ساخت بڑھاپے کا اعلان کرتیں، مگر جسم اس نفاست سے کس لیا جاتا کہ جوانی صدقے قربان ہوتی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جو روپیہ ملا اُس سے ایک مکان خرید لیا تھا۔ اپنے ہاتھوں کبھی کوئی کام نہ کیا تھا۔ بھائی مر چکے تھے، اس لیے ایک عورت کو مع پانچ بچوں کے ساتھ رکھا تھا۔ عورت گھر کا سارا کام کرتی اور برابر کی حقدار بن کر رہتی۔ اب پیسے کی بھی کمی ہو گئی تھی مگر پھل مٹھائی کے بغیر کیسے بسر ہوتی میاں تھوڑا بہت روزانہ لاتے۔ دروازے ملا ہوا جو دالان تھا، اس میں وہ مرادن رہا کرتی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے اس کے بچوں کو

کچھ دے دیتے۔ پھر بیوی کے پاس رکھ دیتے۔ وہ خوش ہو کر سمیٹ لیتیں۔ سامنے کے در پر توتے کا پنجرا ٹنگا رہتا تھا اور توتا کم بخت غضب کا باتونی تھا۔ کوئی گھر میں پہنچا، نام لے لے کر پکارتا کہ بیوی ان کی خاطر کرو۔ کھانوں کے نام بتاتے بتاتے دواؤں کے لیے بھی اصرار کرتا کہ ان کو پلاؤ نا دو۔ مکسچر پلاؤ۔ کونین کھلاؤ۔

ایک روز ہم سب نے حیرت سے دیکھا کہ بجی مع بستر بکس اور توتے کے پنجرے کے چلی آرہی ہیں۔ چہرہ اترا ہوا۔ نہ وہ لہک تھی، نہ تیزی۔ اس دن کچھ نہ بولیں بلکہ دو دن تک کچھ نہ بتایا۔ تیسرے دن میاں آئے اور انہوں نے راز فاش کیا کہ خفا ہو کر آئی ہیں اور وہ انھیں لینے آئے ہیں۔ سب کو تعجب ہوا۔ انتہائے عشق میں شاید یہ بھی ہوتا ہے۔ بہت اصرار کے بعد یہ راز کھلا کہ مردود توتے نے میاں بیوی میں لڑائی کرا دی ہے۔ بیوی کے پاس پھل مٹھائی جو آتی تھی، اس میں اولاد نرینہ پوری حقدار ہوتی تھی۔ اپنے پنجرے سے وہ دیکھتا رہتا کہ میاں دروازے سے نکلتے ہی کچھ نہ کچھ مرادن کے بچوں کو تھما دیتے ہیں۔ اس نے بولنا شروع کیا۔ میاں آئے۔ کیا لائے۔ سیب لائے۔ مرادن مردار کھائے۔ مٹھو کو نہیں ــــ

یہ سننا تھا کہ بیوی کھٹک گئیں اور جب سامان اُن کے پاس آیا تو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ قسم لی کہ سچ بتاؤ کتنا لائے تھے۔ مجھ سے پہلے مرادن کو کیوں دے دیا۔ اور یوں جھگڑا بڑھتا ہی گیا۔ معاملہ سنگین تھا بڑھاپے کی بدگمانی، دوسروں کی تفریح کا ذریعہ بن گئی۔ بہت منت سماجت کے بعد گھر واپس گئیں۔

محبت کی ان کے پاس فراوانی تھی مگر جس لڑکی کو سینے سے لگا لیتیں،

اس کا دم گھٹنے لگتا۔ میاں بھی کچھ کم محبت کی پوٹ نہ تھے۔ بے غرض کارکن، نوکر کسی کے نہیں۔ رات دن کے خدمت گذار۔ کوئی بیمار پڑ جائے، دن رات تیمارداری کو حاضر۔ ڈاکٹر کے یہاں کے چکر۔ اسپتالوں کی دوڑ۔ سر پیر تو خیر سہلایا ہی کرتے تھے، کموڈ تک پھینکتے۔ صاف ستھرا لباس سوکھی لکڑی جیسے بدن پر ٹنگا رہتا تھا۔ ہر وقت دوسروں کے کام اور خدمت پر مستعد، مگر کسی کو ان کی بات کا اعتبار مرتے دم تک نہ آیا۔ خالصتاً سفید جھوٹ بولنے کے عادی تھے اور بیوی کے سوا کوئی ان کی سچائی کا قائل نہ ہوتا تھا۔ بچارے سیدھے سبھاؤ بات کرتے اور لوگ فوراً تجزیہ کرنے لگتے۔ اس میں بیس فیصدی تو ضرور جھوٹ شامل ہوگا۔

انھوں نے بڑے شاندار جھوٹ بولے اور پکڑے جانے پر کبھی شرمندہ نہ ہوئے۔ بے غرض خدمت کی اور کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ صرف انھیں جوانی کے ساتھی بھائی یا دوست کے ممنون احسان رہے جو اپنی کمائی اور پراپرٹی میں ان کا حق سمجھتے تھے۔

وہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بڑے تھے، کیونکہ یہ مسئلہ آخر تک نہ طے ہو سکا۔ ایک بار سب کے اصرار پر بیوی نے اتنا تو ضرور کہا تھا کہ تمھارے چچا مجھ سے دو سال چھوٹے ہیں۔ مگر ذرا ہی دیر بعد جب وہ ٹھنک ٹھنک کر میاں سے کوئی مطالبہ منوا رہی تھیں تو سب کو شبہ پیدا ہوگیا کہ کم از کم چچا سے یہ تیس برس تو ضرور چھوٹی ہیں۔ اولاد سے محرومی نے ان کے دل میں ایسی وسعت پیدا کر دی تھی کہ ساری مخلوق ان کا کنبہ بن گئی تھی۔ ساری عمر سب کی تفریح، ہنسی، مذاق کا نشانہ بنے رہے، مگر نہ کبھی تیوری پر بل آیا، نہ کسی

سے شکوہ شکایت ہوا۔ پہلے میاں نے اللہ اللہ کرتے دم توڑا۔ دو چار ماہ بعد بیوی نے بھی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اور یوں ایک طویل قہقہہ جو پورے ساٹھ سال تک ضلع کے ہر گھر میں خوشیاں بکھیرتا رہا تھا، فضا میں گم ہوگیا۔ جاگیرداری اور زمینداری دور کی پیداوار یہ دو کیرکٹر تھے جواب کبھی نہ پیدا ہوں گے۔ مصاحبیت کے سارے جراثیم اپنے اندر رکھتے ہوئے بھی وہ اپنی ٹھوس مذہبیت کی وجہ سے بال بال بچ گئے۔ بیوی تو خیر تھوڑا رند مشرب بھی تھیں، مگر میاں بہت پاکباز انسان تھے۔ ان کی قبر کے پاس نہ لالہ و گل ہیں، نہ فاتحہ خوانوں کا ہجوم۔ صرف تناور درخت اپنی شاخیں پھیلائے سایہ فگن ہے۔

تنہا۔ اکیلا

اللہ واحد ہے، مگر کبھی کبھی وہ ایسے آدمی بھی پیدا کر دیتا ہے جو بھرا پرا کنبہ بیوی بچے، بھائی، بہن اور دوستوں کی بھیڑ میں بھی تنہا رہتے ہیں۔ یوں تو ہر آدمی اکیلا آیا ہے اور اکیلا جائے گا۔ مگر شادی کی محفل ہو یا غمی کا ہجوم، اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا اور اسے دوسروں سے منوا لینا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اس ٹیکنیکل، سائنٹفک اور مشینی دور میں معلوم نہیں ایسے کیرکٹر اب بنتے ہیں یا نہیں۔ مگر اب سے ۳۰ برس پہلے تک اکا دکا ایسے کردار نظر آ جایا کرتے تھے۔ اور آج بھی جب یاد کرو تو ایسی کوئی نہ کوئی شخصیت چمک کر سامنے آ جاتی ہے۔ لاکھ نظریں بچاؤ، منہ پھیرو، مگر وہ زبان حال سے یہی کہتی ہے: "دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو" مجھے اس وقت ایک جنٹل مین یاد آ گئے۔ ان کا نام آپ الف ب پ کچھ رکھ لیجیے۔ اچھا ہو گا اگر الف رکھیے، کیونکہ وہ بھی اکیلا ہے اور مسٹر الف بھی تین بھائی، دو بہنیں، پانچ بچے، ایک عدد بیوی اور بہت سے سوتیلے چچیرے بھائیوں کے خاندان میں ہمیشہ شامل رہتے ہوئے، اکیلے بالکل اکیلا رہے۔

یہ پرانے رؤسا بھی بڑے ستم ظریف لوگ ہوا کرتے تھے۔ کتنے صاحبزادے چھوڑ گئے کہ ان سب کے حفظ مراتب اور درجہ بندی نے خاندانوں کا تیا پانچا کر کے رکھ دیا۔ مگر مسٹر الف کا خاندان اس معاملے میں زیادہ منصف مزاج اور وسیع النظر تھا۔ اس لیے ان کی تعلیم، تربیت اور خاندان کا جزو بننے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ترقی کے تمام مواقع ان کو حاصل ہوئے۔ عمدہ سے عمدہ لباس پہنا۔ بڑی سی بڑی محفل میں باریاب ہوئے۔ والدین گزر گئے۔ جب بھی بھائیوں اور رشتہ داروں نے گھر کا حقدار سمجھ کر رہنے بسنے پر اعتراض نہ کیا۔ البتہ دخیل کسی چیز میں نہ ہونے دیا۔ نہ کبھی یہ محسوس ہونے پایا کہ اس گھر کی کوئی چیز ان کی بھی ہے۔ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ خوب دنیا گھومے۔ بس مشکل تو یہ آن پڑی کہ لڑکیاں تو احسان مند ہو کر خاندان میں گھل مل گئیں۔ بیوی نے دوسرے تمبر کی پوزیشن قبول کر لی، مگر مسٹر الف بچارے ہوا میں معلق ہو کر رہ گئے۔ بھلا وہ کیسے اس تھرڈ ریٹ ماحول میں رہ سکتے تھے۔ ہندستان کے حسین حصے میں نکل جاتے، ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ گرمیاں مسوری اور شملہ میں گزرتی تھیں۔ سردیوں کے لیے بہترین سوٹ ولایت میں خریدے جاتے۔ زندگی کی تمام آسائشیں اور دلچسپیاں ہاتھ باندھے ان کے حضور میں حاضر تھیں ہزاروں انسانوں کا ہجوم ان کی جیت پر خوشی کے نعرے بلند کرتا تھا۔

نازنینان حرم تک چلمن کے پیچھے سے جھانک کر ٹینس کے اس مشہور کھلاڑی کو دیکھا کرتی تھیں اور یہاں گھر کے اندر گھر کی مرغی دال برابر تھی۔ بھلا ان کی خوددار طبیعت اس کو کیسے گوارا کر لیتی اور انہیں ضرورت ہی کیا تھی۔ جب پیسے کی کمی ہوئی، کسی کے گھر مہمان ہو گئے۔ اس شان سے کہ زندگی کی ہر ضرورت کھانا کپڑے، جیب خرچ اور سفر خرچ کے علاوہ جام و مینا بھی میزبان کو مہیا کرنے پڑتے کیونکہ وہ تعلیم یافتہ عالی خاندان، ٹینس کے چمپئن تھے میسوری پہاڑ دو لی

کی دلہن ہمیشہ آشفتہ سر دولھا کا انتظار کیا کرتی تھی جس کے آتے ہی کھلاڑیوں کی صف میں ہل چل مچ جاتی۔ کلب کی رنگینی بڑھ جاتی اور میچ کے شوقین نوجوان تیزی سے ہوٹلوں کے کمرے ریزرو کرا لیتے۔

لباس میں جدّت۔ گفتگو میں تیکھا پن۔ گردن اتنی اکڑی ہوئی کہ کسی طرف نظر اٹھانا بھی کسرِ شان۔ ہاتھ میں ٹینس کا بلّا لیے جب مسٹر الف فیلڈ میں داخل ہوتے تو تالیوں کے شور سے کان گنگ ہو جاتے۔ خواتین کرسیوں سے اچھل اچھل پڑتیں۔ لوگ کہتے، ظالم بجلی ہے بجلی۔ کیسا کوندے کی طرح چمک رہا ہے۔ کھیلتے کھیلتے یہ ایک نگاہِ غلط انداز مجمع پر ڈالتے اور سب کو اپنی جانب متوجہ پاکر نئے پوز اور نئے اسٹائل سے کھیلنا شروع کر دیتے۔ مجمع سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوتیں اور عین اس وقت یہ پھر ایک نگاہ اپنے قدر دانوں پر ڈالتے۔ تاثر و تردّد محسوس کرتے ہی ایک دوست کو دیکھ کر طبیعت مچل اٹھتی۔

"چودھری مجھے فوراً ٹافی کھلاؤ۔ ورنہ میں کھیل نہ سکوں گا۔" چودھری صاحب بیتاب ہو کر دوڑ پڑتے۔ ارے بھئی جلدی ٹافی لاؤ، ورنہ کم بخت ہاتھ روک دے گا اور غضب ہو جائے گا۔ ایک نہیں، دو چار آدمی ٹافی لینے لپکے اور نہ جانے کن مشکلوں سے چند منٹ کے اندر ٹافی کا پیکٹ کھول کر فیلڈ میں پہنچا دیا جاتا۔ چودھری صاحب پکارے۔ پیارے ٹافی کھالے مگر ہاتھ کی صفائی میں کمی نہ آنے پائے۔ ان دنوں تنک مزاجی بھی اپنے عروج پر تھی۔ موڈ اکثر خراب ہوتا اور لڑ پڑتے۔ دوستوں سے روٹھ جاتے، محسنوں پر برس پڑتے اور جب خمار اُترتا تو گلے ملنے آتے۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے۔ ہر وقت مصروف۔ ہر وقت عُجلت میں۔ رفتار و گفتار

میں وہ تیزی کہ سرتاپا سیمابی کیفیت چھائی ہوئی۔ چھلاوہ تھے چھلاوہ۔ لوگ منتظر ہوتے۔ یہ تیز تیز بولتے ہوئے آتے، ٹہل ٹہل کر بولتے رہتے اور یونہی بکتے جھکتے واپس چلے جاتے۔ پتہ ہی نہ چلتا، وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی۔

دہرہ دون میں گرمیوں کی ایک سہ پہر کو تشریف لاتے۔ لان پر ابھی دھوپ تھی، اس لیے کرسیاں نہیں نکالی گئی تھیں۔ اتنا قرار کہاں تھا کہ دو منٹ صبر کر لیں۔ جھٹ کرسی لے کر صحن کی طرف بھاگے۔ یہ بتانے کی بھی مہلت نہ دی کہ اس کی سیٹ الٹ جاتی ہے۔ وہی ہوا۔ پیچھے سے ہم سب کہتے رہ گئے اور وہاں سیٹ الٹ کر سیدھی ناک کے بانسے پر بیٹھ گئی۔ خون کی دھار بہہ نکلی، اور جیالے اسپورٹس مین پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کیا کیا جتن کیے گئے، تب خون بند ہوا۔ اب بہت خفا، بے انتہا برہم۔ کرسی کو بھی گالیاں دیں۔ کرسی کے مالکوں کو بھی صلواتیں سنائیں اور بکتے جھکتے مسوری چل دیے۔ پھر بہت دنوں تک نہیں آئے اور کسی کرسی کو اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

وہ صرف ٹینس کے چمپئن ہی نہیں تھے۔ اچھے مقرّر، بے دھڑک لکھنے والے جرنلسٹ بھی تھے۔ مصاحبیت کے تمام جراثیم اپنے اندر چھپائے ہوئے۔ ہندوستان کے ہر بڑے آدمی سے برابر کے تعلقات رکھتے تھے۔ کچھ دن پی ٹی آئی سے بھی تعلق رہا۔

کرسپانڈنٹ بنے، ایڈیٹر بھی بنے اور سیاست داں بھی کہلائے۔ مگر ہر چیز چار آنے والی رکھتے تھے۔ اپنی بلند اقبالی کے زمانے میں مسٹر الف دھرتی پر پیر نہ رکھتے تھے۔ کبھی شہر کی سڑکوں پر ایک چھوٹی سی

اسپورٹ کار ادھر ادھر گھوما کرتی تھی۔ اس میں سے آواز کو کم کرنے والا آلہ نکال دیا گیا تھا۔ دور سے اس ڈھول تماشہ بجاتی ہوئی کار کا شور سن کر سب پہچان جایا کرتے تھے کہ کون آرہا ہے۔ اردو کے قدیم شعراء پائے یار کے شورِ محشر پر فدا تھے، مگر ۳۳ء کے اسٹوڈنٹ اس کار کے خرام پُر شور پر عاشق تھے اور کار کے اندر بیٹھنے والے دبلے پتلے سانولے رنگ کے اس جوان کا استقبال کرنے کے منتظر رہا کرتے تھے، جس کی جوانی بگولا باد کا یا برق یا آتش کا انگارا تھی۔ کار رکتی۔ مسٹر الف اس میں اکڑے ہوئے بیٹھے ہوتے۔ آگے ٹینس کے بلّوں کا اسٹاک دھرا ہوتا۔ موٹر کے کسی حصّے میں ٹافی کے پیکٹ، سگار سگریٹ کے ڈبّے۔ کھیر کا پیالہ اور دو چار مئے ناب کی بوتلیں بھی ہوتیں۔ پرانے انگریز نائٹ کی طرح گردن کو ایک طرف خم کیے ہوئے۔ زور زور سے انگریزی میں بات کرتے ہوتے۔ بلکہ کسی قدر چیختے ہوئے مسٹر الف اترتے۔ کسی سے فوراً ہی نوک جھونک ہو جاتی۔ کسی نوجوان کو اسپورٹ کے نکتے سمجھائے۔ کسی کو نصیحت کی، کسی کو ڈانٹا۔ چند منٹ دوستوں سے ملے۔ ٹہلے اور پھر روانہ ہو گئے۔ ٹھہرتے جب ہی تھے جب جیب خالی ہوتی اور چپ چپ ہوتے تھے جن دنوں آبِ حیات سے بھینٹ نہ ہوتی۔ جس محکمے میں کام مل جاتا، پہنچتے ہی، گربہ کشتن روزِ اول پر عمل کرتے اور پہلے ہی دن سے دھونس جمانا شروع کر دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ سخت لڑائی اور استعفے کی نوبت آجاتی، بلکہ افسر خود معافی مانگ کر اپنی جان چھڑا لیتا۔ جتنے دن جیب میں پیسہ رہتا، ہنگامۂ ناؤ نوش، بپا رہتا۔ بڑے خوش مذاق آدمی تھے۔ اس لیے 'لطفِ خرام'، 'ساقی'، اور ذوقِ صدائے چنگ'، دونوں سے شغف تھا۔ مگر عورتیں ان کی زندگی میں

کبھی داخل نہ ہو سکیں، نہ اپنے پاک پیسے کسی طوائف کے ہاتھ میں جانے دیتے۔ ایسے موقعہ پر ہمیشہ انھیں اپنی سیدھی سادی دیہاتی بیوی یاد آجاتی جو بڑی خاموشی سے خاندان میں اضافہ بھی کر رہی تھی اور صبر و ضبط کے ساتھ غربت میں ان ننھے مُنّوں کو پال کر جوان کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ گھر میں موجود تھی، اس لیے حد پہ آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا'۔ اس 'بندگیِ جنونِ ادا'، اور 'بے خودیِ ادب سرشت' کی داد نہ دینا بدمذاقی ہوگی۔ اندازہ کر لیجیے کہ اس عجیب سی وفاداری اور انتہائی لاپروائی کے درمیان بیوی بچے کس شان سے دوسروں کے سہارے پلتے، بڑھتے اور تعلیم پاتے رہے۔ شکر ہے کوئی جاہل بھی نہیں رہ گیا۔ شہ سواری میں اودھ کے بانکوں کا اندازہ انھوں نے اپنا لیا تھا اور نینی تال کی چڑھائیوں میں بیسیوں شاگرد لڑکیاں لڑکے ان سے رائیڈنگ سیکھتے تھے۔

ایک مخلص دوست جب تک زندہ رہے، کبھی ان کو فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے دیا۔ تعجب یہ ہوتا تھا کہ کیسے یہ آگ اور پانی برسوں سے ایک دوسرے کے رفیق بنے ہوئے ہیں۔ خاموشی اور تکلّم کی یکجائی کس طرح ہو جاتی ہے۔ اور رند مشربی تقویٰ سے کیوں کر مرعوب رہتی ہے۔ مگر ایسا ہوا اور پورے ۲۵ برس تک یہ گہری دوستی قائم رہی۔

یہ گپ چپ دوست گھر میں موجود ہوتے یا نہ ہوتے، مسٹر الف بڑی بڑی دعوتیں کر سکتے تھے۔ مہمان ٹھہرا سکتے تھے۔ مشاعرہ منعقد کر سکتے تھے۔ ان کی موٹر، کپڑے، پیسہ، ہر چیز استعمال کر سکتے تھے اور روزانہ ملاقات بھی ضروری نہ تھی۔

ایک دن اسی طرح کی محفل میں شعراء موجود تھے۔ ڈاکٹر گنجو صدارت

فرما رہے تھے اور اس بات پر متعجب تھے کہ صاحب خانہ اس محفل میں کیوں نہیں ہیں۔ شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ آخر میں جوش صاحب نے معذرت کی کہ اب اجازت دیجیے۔ میرے طلوع ہونے کا وقت آگیا ہے۔ کچھ لوگ ابھی اور سننے کے مشتاق تھے۔ مسٹر الف نے کہا "آپ جس کام سے جانا چاہتے ہیں، میں سمجھ گیا۔ مگر وہ یہاں بھی ہو سکتا ہے۔ میرے کمرے میں تشریف لے چلیے۔" جوش نے بیساختہ جواب دیا "یہاں کعبہ میں۔ نا بابا، میں یہ گناہ اپنے سر نہیں لے سکتا"

اور پھر بڑھاپے کی آمد آمد شروع ہوگئی۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا داستان حیات کے مختلف باب ہوتے ہیں۔ جوانیاں، بڑھاپے تک پہنچتے پہنچتے، معلوم نہیں کتنی کہانیاں رومانی افسانے اور عجیب سی داستانیں قلم بند کر دیتی ہیں۔

لیکن مسٹر الف کی داستان حیات میں صرف 'جیت' کا عنوان 'ہار' سے بدلا۔ اب تو صرف یہ خبریں ملتی تھیں، 'فلاں جگہ ٹیم لے کر گئے'، 'ہار آئے' وہ چینی وبھرتی اب کہاں تھی جس پر ہندوستان کیا یورپ بھی فدا تھا۔ ملک آزاد ہو گیا تو سیاسی ہنگامہ خیزی نے سنجیدگی کا رنگ اختیار کر لیا اور ترپ کے سب پتے اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ بڑھاپے سے اللہ بچائے ہر بھلا آدمی اس سے پناہ مانگتا ہے۔ شاعروں کے تو، اندیشہ پیدا ہوتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مومنؔ کہتے ہیں:

موسپیدی کے قریب اور یہ غفلت توبہ
نیند آتی ہے بہ اندازِ دگر آخر شب

ظریف لکھنوی کی حقیقت پسندی، حسن وضعیفی کو دیکھ کر یوں تلملا اٹھی

رخ روشن کی جھری حسن کا گویا ٹھٹھر جانا
قیامت ہے کسی معشوق کا سن سے گزر جانا

جھریوں پر یاد آیا۔ کسی اور شاعر نے بھی کہا ہے:

یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چُنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

اور جوش نے بڑے خوبصورت طریقے سے دعا کی ہے:

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یارب
جی چاہے تو دوزخ میں جلانا یارب
معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب

قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ وہ دن آگیا اور اب جس محفل میں یہ بوڑھے بابا 'ہائے جوانی ہائے زمانہ' کہتے ہوئے میلے ٹھیلوں میں دھکّے کھانے نہیں، 'الجھانے کی داستان بیان کرتے ہیں تو جوانیاں منہ پر رومال رکھ کر منہ پھیر کر ہنستی ہیں اور نظروں ہی نظروں ایک دوسرے کو ان بوڑھے چونچلوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

لیکن مسٹر الف کے تعلقات کبھی عورتوں سے اچھے نہیں رہے۔ میرا خیال ہے شاید ہی کوئی ٹاپ موسٹ لیڈی ایسی ہوگی جس سے اُن کی جھڑپ نہ ہوئی ہو۔ اس میں ان بچارے کا کوئی قصور نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ سب بیویاں اُن سے جلتی تھیں اور حسب معمول اپنے شوہر کو ان کی صحبت سے بچانا چاہتی تھیں۔ بڑھاپے میں تو انہوں نے بالکل ہی حوّا کی بیٹیوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ لکھنؤ کی کسی معروف سڑک پر، دُبلا، کمر خمیدہ،

لنگڑاتا ہوا ایک انسان خستہ پتلون اور کھٹیچر جوتے میں آپ کو نظر آجائے تو سمجھ لیجیے، وہ مسٹر الیف ہیں۔ اب وہ بولتے بالکل نہیں ہیں۔ کہیں آتے جاتے بھی نہیں۔ اپنے گاؤں میں بیوی کے پاس گوشہ نشین ہیں حالانکہ اس سے پہلے وہ ہر گھر میں رہے تھے، ہوا اپنے گھر کے۔ کسی زمانے میں اپنی اہمیت کا احساس کسی وقت ان کا پنڈ نہیں چھوڑتا تھا۔ اور اپنی انا، پر وہ ہر چیز قربان کر سکتے تھے۔ اس سے پہلے بھی ان پر خاموشی کے دورے پڑ چکے تھے۔ جب بھی توشہ خانہ میں صرف کھاری سوڈا رہ گیا۔ ان کی بولتی بند ہوگئی۔ اور جب بھرپور ہو گئے، زار و قطار رو لیے یا چار چوٹ کی لڑائی لڑ لیے۔

مگر آج وہ چپ ہیں۔ ان کی زندگی سنسان ہے۔ آخری کارنامہ انھوں نے یہ انجام دیا کہ اس شخص سے بھی لڑے جس نے ان کی خاطر ایک نئی اونچی جگہ پیدا کر کے ان کو کام سے لگا لیا تھا۔ شاید وہ پوسٹ ان کی تا حیات پنشن بن جاتی۔ مگر خدا بھلا کرے، افتاد طبیعت کا۔ سویا ہوا فتنہ پھر بیدار ہوگیا۔ خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اور طبیعت حسب معمول ایسی چونچال ہوئی کہ ہوا میں اڑنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا پنکھ ٹوٹ گئے۔ زبان بند ہوگئی۔ وہ مخلص دوست بھی اب زندہ نہ تھے جو سہارا دیتے اور پھر "نہ کہیں جہاں ہیں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی" اسی بیوی کے آنچل تلے جس کے بارے میں کبھی ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ کہ اس کا مصرف کیا ہے؟ اور اس کا کیا بنایا جائے؟ زندگی ہوٹل، ریل، ہوائی جہاز، کسی سفر میں وہ اس کے ساتھ نہیں رہے، مگر اب معلوم ہوتا ہے، سفر آخرت اسی کے ساتھ کرنا پڑیگا۔ حکومت نے بھی تو ان کی خبر نہ لی۔

اب انہیں صرف ان کے دو تین اعزّا اور پرانے دوست پہچانتے ہیں۔ بھلا اس ۷۰ برس کے بوڑھے کو کون پہچانے۔ نہ وہ اُپج ہے نہ ظرافت ایک سکوت مسلسل ہے اور یاد رفتگاں:

هم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

شوہروں کی قسمیں

کہتے ہیں آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔

لیکن آزادی پیدائشی حق ہو یا نہ ہو، اس میں تو کوئی شک نہیں۔ شادی ہمارا پیدائشی حق ہے اور اس حق کا استعمال سب سے زیادہ ہندوستان میں ہوتا ہے۔ ایسے ملک میں جہاں لڑکیاں پیدا ہی ہوتی ہوں صرف شادی کرنے کے لیے، وہاں تو اور بھی زیادہ ضرورت ہے کہ سستے اور بڑھیا قسم کے شوہروں اور قیمتی اور گھٹیا قسم کی بیویوں کے متعلق معلومات فراہم کر دی جائیں۔

بہت عرصہ ہوا لکھنؤ سے ایک رسالہ "معلومات" عبدالوالی صاحب کی ایڈیٹری میں نکلتا تھا۔ اس میں ایک عنوان دیا گیا تھا "بیوی کیسی ہونی چاہیے۔" اور لکھنے والوں نے اس عنوان پر خوب خوب طبع آزمائیاں کی تھیں ایک صاحب نے لکھا تھا کہ

بیوی کو بہت سریع السیر اور زود ہضم ہونا چاہیے اور خزاں کے پہلے ہی جھونکے میں اسے شاخ کے پتے کی طرح جھڑ جانا چاہیے کیونکہ شیخ سعدی نے کہا ہے

زن نو کن اے دوست ہر نو بہار   کہ تقویم پارینہ ناید بکار

دوسرے صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ بیوی پائیدار مستقبل اور ایسی عمر خضر لے کر آئے کہ تمام آفات ارضی وسماوی اس پر سے چکنے گھڑے پر پڑی ہوئی بوند کی طرح پھسل جایا کریں۔ اتنی ہلکی پھلکی اور مختصر ہو کہ ہینڈ بیگ میں ڈال کر ہر جگہ لے جاسکیں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن بھئی مردوں کی تو بات ہی دوسری ہے۔ وہ چاہے دیا سلائی کی ڈبیہ یا میٹھے چاول کے بہانے بیوی کی ہنسی اڑائیں یا "ننھے کی اماں" سے اٹکھیلیاں کریں۔ ہے کوئی ٹوکنے والا؟ عورتیں خود ہنس کر پڑھتی اور خوش ہو کر سنتی ہیں۔ جواب دینا تو درکنار تیوری پر بل تک نہیں آتا۔ اس جگ ہنسائی کی غیرت ہوتی تو ننھے کے ابا کو ذرا آئینہ دکھا دیتیں جو اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔

زمانہ بدل جاتا ہے لیکن آدمی کی فطرت تو بدلتی نہیں۔ مستقبل کا ہندوستان ممکن ہے ان میں ایک آدھ قسم کا اور اضافہ کر دے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی اس وقت میوزیم میں رکھنے کے لیے بھی نہ مل سکے اس لیے نئے اور پرانے ہر قسم کے شوہر دیکھ لیجیے۔

یہ تو ریڈیو والوں کو آج سوجھی اور پوچھ بیٹھے کہ "شوہر کیسا ہونا چاہیے" اور میں نے سوچا کہ بجائے "پنج انگشت یکساں" بنانے کے لیے یہ زیادہ بہتر ہوگا یہ دکھا دوں "ایسے ہوتے ہیں"۔ شوہروں کی قسمیں بیان کرنا کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے۔ یہاں قدم قدم پر کانٹوں سے الجھنے اور مذہب کی چٹان سے ٹکرا جانے کا خوف ہے۔ اس لیے پھونک پھونک کر قدم دھر رہی ہوں۔

اس وقت برسوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک دن کئی سہیلیاں بیٹھی ہوئی آپس میں گپ شپ کر رہی تھیں۔ دوران گفتگو میں ایک ملنے والی

---

۱ شوکت تھانوی ۲ ملا رموزی۔

کا ذکر چھڑ گیا جن سے شادی کے بعد شاید ملاقات کی نوبت نہ آئی تھی۔ میاں کی پوچھ گچھ تو ہندوستانی عورت کی خاص عادت ہوتی ہے۔ ان کے شوہر کا حال چال پوچھا تو ایک بیوی بے ساختہ بول اٹھیں "اے بہن اس غریب کا کیا حال پوچھتی ہو۔ اس کو تو ایسا کڑی کمان میاں ملا ہے کہ نتھنوں میں دم آگیا ہے۔" سن لیا آپ نے شوہر کی ایک قسم کڑی کمان بھی ہے۔

اور اس زوردار قسم "کڑی کمان" کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی بیوی ہر وقت بھیگی بلی بنی رہتی ہے۔ "کڑی کمان" گھر میں قدم رکھنے سے پہلے منہ بگاڑ کر اور تیوریاں چڑھا کر گردن تانے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔ بچوں کو گھورا، نوکروں پر نگاہ غلط ڈالی۔ بیوی کو تیز تیز نظروں سے دیکھتا ہوا تخت یا پلنگ پر اکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب بولے کون؟ اور پاس کون جائے؟ کس کی مجال ہے جو بے بلائے شیر کے منہ میں چلا آئے۔

وہی بیوی نگوڑی بال کی باندھی پھر جان پر کھیل کر ہمت کرتی ہے اور ان زہر بجھے تیروں کی زد میں آکر کچوکے بھی کھاتی جاتی ہے اور ڈرتے ڈرتے کوئی سوال بھی کر لیتی ہے۔ اُدھر سے بھی کوئی کڑوا کوئی میٹھا آدھا تیہا جواب مل گیا تو طبیعت کھل اٹھی۔ نہ ملا تو سمجھ گئی پارہ چڑھا ہوا ہے۔ بس پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ کھانے کی گرمی پانی کی ٹھنڈک اور پان کی بید مشک چھڑک کر تسکین دی۔ اور ہوتے ہوتے دن کاٹ کر رات کو نیند کے سپرد کر دیا۔

عقلمند بیوی تو اسی طرح سر سہلاتے سہلاتے جوانی میں نہ سہی تو بڑھاپے میں ضرور ہی "فرعونیت" والی رگ کاٹ دیتی ہے لیکن بے چاری سیدھی سادی بیوی لونڈی بن کر جانوروں کی طرح زندگی تیر کر دیتی ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ دوسرا دیس ہو تو "اپنی اپنی خنجری اپنا اپنا راگ" ہو جائے یہاں باپ دادا کی لاج آڑے

آجاتی ہے۔

لیکن ایسے شوہروں کی بیویاں عموماً اتنی خوددار ہوتی ہیں کہ نہ کسی کو بتانا چاہتی ہیں اور نہ برائی سننا پسند کرتی ہیں۔ شاید اس میں انہیں اپنی سُبکی نظر آتی ہو گی۔ اس لیے میرا گھر کی بھیدی بننا شاید ان سب کو ناگوار ہو گا۔ "کڑی کمان" تعلیم یافتہ بیوی کے ذہین دماغ سے اپنی کھوس عقل کو ٹکرانا کبھی پسند نہیں کرتا۔ جان بوجھ کر ایسی "موہنی" لائے گا جو اسے دیوتا مان کر پوجے۔

"کڑی کمان" کی بالکل ضد "نیاز مند" شوہر ہوتے ہیں جو چاہے جتنے پڑھے لکھے عالم فاضل کیوں نہ ہوں ان کی عقل اور سمجھ چاہے ساری دنیا سے اپنا لوہا منوا لے مگر بیوی کے پاؤں تلے دبی رہتی ہے۔ شہروں میں رواج ہے کہ آرسی مصحف کے وقت شادی کے روز دولہا سے کہلوایا جاتا ہے: "بیوی تم شیر میں بھیڑ۔"

سو کبھی نیاز مند کی بیوی سچ مچ شیر ہوتی ہے جس کی گرج دار آواز میاں کے بدن میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے۔ بیچارہ سہما ہوا اندر آتا ہے اور اس کا اترا ہوا منہ دھیمی دھیمی مسکراہٹ اور پیار بھری نظریں دیکھ کر بیوی کو ترس آ ہی جاتا ہے اور یوں میدان جنگ ناگوار خاموشی سے بدل جاتا ہے۔

بیوی سے بات کرنے سے پہلے چہرہ کا اتار چڑھاؤ، تیوری کا بل سے خالی ہونا حتیٰ کہ نوکر اور بچوں تک کو پرسکون دیکھنا ضروری سمجھتا ہے اور پتے تلے جملے کہہ کر آس بھری آنکھوں سے منہ تکتا ہے کہ اچھی لگی یا بُری؟

چاہے جتنا عالم و عاقل ہو مگر خود اعتمادی سے عاری رہتا ہے اور شاید اسی لیے بیوی کی اینچ اور ہٹ دھرمی میں پناہ ڈھونڈھتا ہے۔ اس میں شک نہیں وہ خود ہر وقت خوش رہتا ہے سب کو خوش رکھتا ہے راحت و سکون کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ کنجوس ہو یا نہ ہو فضول خرچ ہر گز نہیں ہوتا۔ بیوی اپنی سہیلیوں

میں بیٹھ کر اس پر فخر کرتی ہے۔ بچے اس سے محبت کرتے ہیں خاندان بھر اسے کمزور جانتا ہے اور دوست احباب "زن مرید" کی پھبتی کستے ہیں لیکن وہ نہ تردید کرتا ہے نہ اقرار۔

بحیثیت ایک عورت کے شاید میں کہدوں کہ یہ سب سے اچھا شوہر ہوتا ہے۔ اور ناظرین کو اس سے اختلاف ہو اس لیے قارئین ہی پر فیصلہ چھوڑ دینا بہتر ہوگا۔ ویسے دنیا کے بڑے بڑے اہل علم لوگوں میں سے "نیاز مند ہوئے ہیں۔

۱۹۳۵ء-۳۶ء میں ہندوستان کے گلی کوچے میں "اسلام خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگتا تھا۔ لیکن کسی نے ان اللہ کے بندوں سے نہ پوچھا کہ کتنی صدیوں سے انسانیت خطرے میں گزر بسر کر رہی ہے آخر تمہیں اس پر رحم کیوں نہیں آتا۔ یہ خطرہ اس وقت تو اور بھی مجسم بھیانک ہو جاتا ہے جب شوہر قرآن و حدیث کے حوالے سے رعب داب قائم کرنے پر اُتر آئے۔ عرف عام میں انہیں "حضرت سلامت" کہتے ہیں۔ آپ نے کبھی ایلورا کے غار اور ان کی نقاشیاں دیکھی ہیں؟ بس اسی میں کا کوئی مجسمہ انتہائی ہی ٹھس اور بے حس سمجھ لیجیے۔ وہ ایک یا ایک سے زیادہ بیویوں کا شوہر، چند بچوں کا باپ اور سارے خاندان کی نکیل اپنے ہاتھ میں رکھ کر بھی خوش نہیں ہوتا۔ نہ اسے گھر کے اندر خوشی ہوتی ہے نہ باہر کسی دلچسپی کی ضرورت۔ شادی کا مقصد کتب مذہبی کے حوالہ سے صرف "تکثیر نسل" قرار دیتا ہے۔ "حضرت سلامت" ہنسنے، زور سے بولنے اور تیز چال چلنے پر بھی معترض ہے۔ انسانی فطرت کی ان دونوں کمزوریوں یعنی ہنسنے اور رونے کو خلاف شرع سمجھ کر سختی کے ساتھ دبا دیتا ہے۔ بیوی کو گھر کے تمام افراد کی بہ نسبت قدرتاً زیادہ قربت حاصل ہوتی ہے اس لیے وہ سمجھ بوجھ کے ساتھ اونچ نیچ دیکھ کر بات کرتی ہے لیکن دوران گفتگو ایک لفظ بھی ضرورت سے زیادہ زبان سے نکلا اور اس کی جھکی ہوئی نظر فوراً اٹھ کر تنبیہ کرتی ہے کہ

"ہائیں یہ بے ادبی" اس میں شک نہیں اس کی دنیا بیویوں اور بچوں تک محدود ہوتی ہے۔ ضرورت بھر کا روپیہ بیوی کو دے کر اپنے ہاتھ پیر کھلے رکھتا ہے۔ ساری کمائی اس کی گود میں نہیں ڈالتا لیکن یہ سب انہیں کے لیے اور ان کے آڑے وقت کے لیے کرتا ہے بیوی بچوں کی ضروریات کا تعین خود کرتا ہے وہ خود ٹھنڈا ہے اور اس کا گھر اس سے زیادہ جہاں خوشی اور غم دونوں برف کی طرح منجمد ہوتے ہیں۔

۱۹۲۰ء کی سیاسی توتومیں میں نے ایک نئی قسم "لیڈر" کا بھی اضافہ کیا ہے جس کی نمایاں خصوصیت پلیٹ فارم پر بے تکان قوت گویائی اور گھر کے اندر گونگا پن ہے۔ معلوم ہوتا ہے بیسویں صدی کے اس انسان کی روح اپنشدوں کے زمانہ ہی میں مکمل ہو چکی تھی۔ کیونکہ اسے ہر پرانی بات اچھی لگتی ہے اور ہر نئی چیز سے نفرت ہوتی ہے۔ داڑھی اور چٹیا کو ملک و قوم پر دھونس جمانے کا ہتھیار سمجھ کر بڑھاتا ہے۔ مفلس تو خیر ہوتا ہی ہے اور دیش سیوا سے اتنی فرصت بھی نہیں ملتی جو بیوی بچوں کا پیٹ پالے، مگر کھانے والوں کی تعداد میں اضافے کو خدا کی مرضی اور بیوی کی زیادتی سمجھ کر صبر و شکر سے برداشت کر لیتا ہے۔

اس کو دنیا کی ہر بے ہنگم، موٹی اور بدصورت چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بد قطع کپڑے۔ بدصورت تھیلا۔ ہونق چہرہ بنائے بچوں کے مستقبل سے بے فکر، ملک کی دنیا اور اپنی عقبیٰ سنوارتا رہتا ہے۔ عورت کی خوبصورتی اور بدصورتی پر غور کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں ہوتا نہ اسے حکومت کرنا آتا ہے نہ محبت کرنا۔ مگر شادی ضرور کرتا ہے۔ غلام ہندوستان کی آبادی بڑھانے سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ گھر سے ہمیشہ لاپرواہ رہتا ہے مگر بیوی سے لاپرواہ نہیں ہوتا۔ اکثر جیل بھی اسے ساتھ ہی لے جاتا ہے۔ بیوی کو گھر اور بچے سپرد کر کے ہوں ہاں کہتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ عورت کی نزاکت و زیبائش

سے وہ چرخہ اور کرگھے کو زیادہ پسند کرتا ہے لیکن بیوی کی نظر میں وہ ہمیشہ معزز رہتا ہے کیونکہ ہندوستان کی محبت کرنے والی عورت اپنے میں ستی کا جذبہ پیدا کرکے جیتے جی ملک کے پتا پر قربان ہوتی رہتی ہے۔

فطرت انسانی کا خاصہ ہے جو کچھ پاس نہیں ہوتا اس کا اشتیاق بڑھتا ہے اور جو ہے اس کی قدر نہیں ہوتی۔ "گھر کی مرغی ہمیشہ ساگ برابر" رہتی ہے۔ نک سک سے درست بیوی میں ہزار نقص میاں کو نظر آتے ہیں اور کماؤ نیک خوبصورت شوہر میں بیسیوں برائیاں بیویوں کو دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اس دیس میں ایسے منچلے شوہر بھی موجود ہیں جن کو بیوی کے لفظ سے چڑ ہوتی ہے اور جن کے نزدیک "دنیا کی بہترین عورت بھی بیوی کا جامہ پہن لینے کے بعد قابل نفرت ہو جاتی ہے۔" اس کی تمام تیزی، ذہانت اور عقل دلچسپیوں اور مسرتوں کے نئے نئے سامان اکٹھا کرنے میں صرف ہوتی رہتی ہے۔ "منچلا" جیتا ہے زندہ رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے۔ دوسروں کو مار کر بھی جینے کے لیے جس طرح اس کی دنیا وسیع ہوتی ہے اسی طرح حلقۂ احباب بھی۔ موقع اور وقت سے فائدہ اٹھانا اس کا شیوہ ہے اور دوسروں کی حماقت سے فائدہ نہ اٹھانے والے کو وہ پرلے درجہ کا احمق سمجھتا ہے۔ کبھی وہ خود بھی تباہ ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے بہتیری زندگیاں تباہ کر ڈالتا ہے۔ مصیبت میں پھنسا کر قہقہہ لگاتا ہے۔ بسمل بنا کر تماشہ دیکھتا ہے۔ زندگی اس کے نزدیک کھانے کمانے اور عیش کرنے کا نام ہے۔ اور جوانی آتی ہے بھونرے کی طرح دنیا کا رس چوس لینے کے لیے۔

بیوی سے اس کو نفرت ہوتی ہے۔ بچوں سے بیزار رہتا ہے۔ اپنے مرد ہونے پر اس کو فخر ہوتا ہے اور عورت کو چند دن سے زیادہ برداشت نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک "وہ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔" جب ہاتھ پاؤں تھک جاتے ہیں، دماغ ماؤف ہو چکتا ہے اور "یاران کہن" دامن جھٹک کر الگ ہو جاتے ہیں تب بھی وہ یہی کہتا ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

لیکن اسی ملک میں شوہر کی ایک قسم "بھونگو" بھی موجود ہے جس کی زندگی کا مقصد ہی بیوی کی خاطر مدارات، بچوں پر پیار و شفقت اور عزیزوں پر لطف و احسان ہے۔ بیوی سے محبت اور سسرال والوں کی مہمان نوازی میں کبھی کمی نہیں کرتا لیکن اس کے نالایق دوست اسے بیوی کا غلام سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے بھونگو کی بیوی ان دوستوں پر پورا کنٹرول رکھتی ہے۔ وہ خود بھی دوستوں کی تعداد میں کمی بیشی بغیر اجازت نہیں کرتا۔

گھریلو کاموں مثلاً سودا خریدنے، رشتہ داروں کے گھر شادی غمی میں آنے جانے اور خاندانی جھگڑا چکانے میں اسے خاص مزہ آتا ہے۔ چھوٹی سی چیز کے لیے سارے شہر کا چکر لگانا اور سودے والوں سے جھگڑنا بھی بیوی کی خوشامد میں گوارا کر لیتا ہے۔

بیوی چاہے الٹا توا ہو مگر وہ اس کی خوبصورتی کا قائل ہوگا۔ چیچک کے داغ بھی اس کو مثل ستارہ جڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ یوں بیوی کے سامنے تو بڑا سیدھا بنا رہتا ہے لیکن دوستوں کے حلقہ میں بازاروں اور سڑکوں سے گزرتے ہوئے نظر بازی اور ندیدے پن سے کبھی نہیں چوکتا۔ حسن رہ گذر کو مال مفت سمجھ کر بے رحمی کے ساتھ گھورتا ہے اور اپنی اس معصوم عیاشی کو بیوی کے سوا اور کسی سے چھپانا بھی نہیں چاہتا۔

گھر پر محبت اور حماقت کے زور سے حکومت کرتا ہے۔ کبھی کبھار کھانے میں

دیر یا بیوی کی کسی بے وقت تفریح یا روپیہ کی کمی اسے برہم کر دیتی ہے وہ اس وقت وہ اپنے غصہ کو بالکل گولے کی طرح چھوڑ دیتا ہے۔ بہت مہینوں اس عبرتناک واقعہ کا تذکرہ بیگم اور نوکروں کی زبان پر افسانہ بنا رہتا ہے۔ بیگم کی عقلمندی اور اس کی ضرورت دونوں کا قائل ہوتا ہے۔ بلکہ بچوں سے زیادہ بیوی کی ضرورت کا مگر بچوں کو سود در سود سمجھ کر خندہ پیشانی سے وصول کرتا رہتا ہے۔

اب ذرا لوکل قسم کے دو ایک شوہر دیکھ لیجیے۔ یہ صرف صوبہ اودھ کے صدر مقام یا اس کے گرد و نواح میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی نزاکت اور نفاست پسندی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ الفاظ تک نسوانیت میں ڈوبے ہوئے چال لچکدار انداز میں بانکپن، گفتگو شستہ، الفاظ ترشے ہوئے زیادہ تر شاہ و شہر یار سے سلسلہ نسبی ملاتے رہتے ہیں۔ بیوی بھی کچھ ہیٹی نہیں ہوتی۔ مٹی ہوئی بادشاہت اور گزری ہوئی امارت کے نشے میں میاں کے نازنین دل ہی کو اپنا تختۂ مشق بنائے رکھتی ہے۔ بیچارہ شوہریت کا علمبردار چلتے ہوئے لڑکھڑاتا اور بات کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ وہ زبان جو محفلوں میں قینچی کی طرح چل رہی تھی، گھر کے اندر گنگ ہو جاتی ہے۔ شرماتا لجاتا کپڑوں کی شکست مٹاتا ہوا گربۂ مسکین کی طرح دبے پاؤں اندر آتا ہے لیکن کبھی کبھار وہ اپنی غرغراہٹ سے نوکروں اور بچوں کو خوف زدہ بھی کر دیتا ہے۔ اور بیوی کا دست قاتل اور انوکھے محاورے اس کو مجبور کر دیتے ہیں ؎

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

کہ دیوان خانہ میں جا کر پناہ لے۔ اس لیے نہیں کہ وہ بزدل یا کمزور ہے اس لیے کہ کہیں دو پہاڑوں کی ٹکر گھر کی بنیادوں ہی کو نہ ڈھا دے۔ کیونکہ دونوں ہی شاہان رفتہ کا جاہ و جلال اپنے خون میں رچے بیٹھے ہیں اور پھر دو چار گھنٹہ بعد وہ مسکراتا

اور گنگناتا ہوا اندر واپس آ جاتا ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اسی خطہ میں ایک صنف اور بھی عام ہے جسے عورتوں کی زبان میں "نکھٹو" کہتے ہیں۔ بیوی کی مشقت یا خاندانی وظیفہ اس کا ذریعہ معاش ہوتا ہے۔ وہ گھر کی عزت بیوی کی عفت اور بچوں کی صحیح النسبی کا گواہ ہوتا ہے۔

اگر نان و نفقہ کا موروثی سہارا نہ ہو تو وہ بیوی کے قوت بازو پر بھروسہ کرتا ہے لیکن جسم کے ان اعضاء کو جو صرف آرام کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ہلا ڈلا کر خدا کی ناشکری کرنا پسند نہیں کرتا۔ کھانے پینے کی فکروں سے بے بنیاد بیوی کی کمائی سے بنوائے ہوئے سفید کپڑے پہن کر چھیلا بنا ہوا گھومنے نکل جاتا ہے اور ان مردوں کو محنت کا پسینہ بہاتے دیکھ کر اس کا دل بہت کڑھتا ہے جو اپنی بیویوں کی محبت و شفقت سے محروم ہیں۔

وہ بڑا صابر و ضابط ہے۔ بیوی کی ہر زیادتی یا بد زبانی حتیٰ کہ گالیوں تک کو شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی جاتا ہے۔ ایک بولنے والی بیوی اور چند رونے والے بچوں کو خدا کی دی ہوئی لازوال نعمت سمجھ کر شکر و احسان کہتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔

اکثر عورتیں جب تعریف کرنے پر اتر آتی ہیں تو کہتی ہیں اے بہن وہ تو بس ایسی اللہ میاں کی گائے ہیں کہ دس باتیں بھی سنا ڈالوں تو الٹ کر جواب نہ دیں، نہ کسی کی اچھائی میں نہ برائی میں تیہر ستی میں کچھ ہو جائے اس بندہ کو تو اپنے گھر سے غرض ہے۔ یہ ہے وہ سرٹیفکٹ جو بیوی سے "اللہ میاں کی گائے" کو ملا ہے۔ کوئی اسے اچھا کہے یا برا لیکن بیوی اگر عقلمند نہ ہو تو اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتی۔

اس کے وجود میں قابل ذکر شے صرف "حسن نظر" اور بے حسی ہے۔ نہ کسی کو

دیکھ کر جی بھر خوش ہونے کی طاقت، نہ غم و غصہ کے اظہار پر پوری مقدرت، بس قدرت نے تلافیِ مافات کے لیے زیرِ لب تبسم اسے عطا کر دیا ہے جس سے جا و بے جا کام لیتا رہتا ہے۔ مقصدِ حیات۔ بیوی کی اطاعت، ماں باپ کی خدمت اور بچوں پر شفقت ہے۔ زندگی کے آخری لمحہ تک وہ اپنی کمزوریوں کو بیوی کے آنچل تلے چھپائے رکھتا ہے۔

ان سب کے بعد لیکن ان سب سے اونچی اور خوفناک قسم "سنکی شوہروں" کی ہے۔ جو الٹی مانتے ہیں نہ سیدھی۔ بقول سعدی "گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت دہند" نہ انھیں عورت کی شرم اچھی لگے نہ اس کی بیباکی۔ وہ عورت جو راستہ چلتے ان سے مخاطب ہو جائے ان کو گولی مار دینے کے قابل نظر آئے گی۔ اور جو لجاتی بدن چراتی شرماتی ہوئی سامنے آئے وہ تو بالکل ہی گلا گھونٹ دینے کے لائق ہے لیکن ایسی عورت کے سامنے وہ گھٹنے ٹیک دینے میں تامل نہ کرے گا۔ جو اس کی بے باکی کا جواب سینہ پر چڑھ کر دے اور جو بات کا جواب تھپڑ سے دے۔

نہ اسے بیوی کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ یہ بات آج تک اس کی سمجھ میں آئی ہے کہ کم بخت اس عورت ذات کا کیا بنایا جائے۔ اس کا مقصد اور اس کا مصرف بغیر سوچے سمجھ میں آتا نہیں۔ اس لیے بیوی کی محبت، اس کا کچھ پیدا کرنے سے کبھی نہ تھکنا، اس کا سنگھار، اس کی نسوانیت، سب ہی چیزیں "سنکی" کو زندگی سے بیزار کر دیتی ہیں۔

"سنکی" کتابوں کا کیڑا اور کرسی کا دشمن ہوتا ہے، وہ کرسی کے تناؤ سے زیادہ اس کی گہرائی پسند کرتا ہے۔ بیوی کے لیے دم گھٹنے کا سامان اور بچوں کی دلچسپیوں میں برابر کا شریک رہتا ہے لیکن اولاد کی تربیت کے متعلق اس کا جو نظریہ ہوتا ہے

اس پر دنیا میں کوئی ماں عمل نہیں کر سکتی۔ وہ بچوں سے گڑیا اور گیند کی طرح کھیلتا اور کھیل ہی کھیل میں سائنس اور فلسفہ ان کے دماغوں میں ٹھونس دینا چاہتا ہے اور جب اس میں ناکامی ہوتی ہے تو اس کا دل چاہتا ہے ایسی نالائق اولاد کو سر سے اونچا اٹھا کر زمین پر پٹخ دے۔ بے چارے کا محبت کرنے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن یہ مسئلہ ہمیشہ زیرِ غور رہتا ہے کہ کس سے محبت کی جائے۔

سنکی تعلیم یافتہ بیوی سے جھگڑے میں ساری عمر صرف کرتا ہے اور جاہل کندۂ ناتراش بیوی کو خرادتے میں زندگی گنوا دیتا ہے لیکن مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔

کہتے ہیں سقراط کو جب زہر کا پیالہ پینے کے لیے دیا گیا تو اس کی بیوی رونے لگی۔ سقراط نے کہا "نیک بخت زہر میں پی رہا ہوں، تو کیوں روتی ہے۔" بیوی نے جواب دیا "اس لیے روتی ہوں کہ تم بے گناہ مارے جا رہے ہو۔" کہنے لگا "ہش پھر کیا تو چاہتی تھی میں گنہگار مارا جاتا۔" یہ تھی سب سے اعلیٰ قسم سنکی شوہر کی۔ بیوی کو اس وقت معلوم نہیں کیا کچھ یاد آ رہا ہوگا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر معلوم ہوتی ہوگی گناہ و بے گناہی کا فلسفہ کب یاد آتا۔

آپ نے اتنی دیر میں کئی قسم کے شوہر دیکھ لیے۔ اب ذرا دو باتیں اور سن لیجیے۔ بہنوں سے میری درخواست ہے کہ میرے تیار کیے ہوئے لباس کو ہرگز اپنے شوہروں کے جسم پر فٹ کرنے کی کوشش نہ کریں اور بھائیوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس دھندلے خانہ ساز آئینہ میں اپنے چہرہ دیکھیے کہیں آپ بھی نہ ہوں۔

یہ مرد

یہ مرد جسے "کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتائے نہ بنے۔" مذہبی نقطۂ نظر سے فرشتوں کا مسجود، زمین پر نائب الٰہی اور عورت کا دیوتا یا خدائے مجازی سہی، لیکن تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھ کر تو کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ یہاں ہر شے کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور پھر "نظر اپنی اپنی خیال اپنا اپنا" کوئی کچھ دیکھتا ہے کوئی کچھ۔

جب مرد کی قوتِ عمل اس کے دنیا میں حیرت انگیز کارنامے اور اس کی دلکش شخصیت پر نظر ڈالیے تو کس کافر کو اس کے اشرف المخلوقات ہونے میں شک رہ جاتا ہے لیکن جب اسے جنگلوں کو روندتے، پہاڑوں کی چوٹیاں پھلانگتے اور آسمان میں ٹکٹکی لگائے دیکھو تو بے اختیار ڈارون کے نظریہ پر ایمان لے آنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر جب اس کے اٹھائے ہوئے فتنے، شورشیں اور قتل و غارت گری کا تماشا نظر آتا ہے تو اس کے جنت سے "بیک بینی و دو گوش" نکال دیے جانے کا راز سمجھ میں آجاتا ہے جسے وہ آج تک نہیں بھولا ہے کہ

من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود
آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

اور پھر جب اس کو کسی دوکان پر آلتی پالتی مارے ہوئے پیسہ گن گن کر تھیلی کو اپنا ہی جیسا مدوّر بنائے دیکھیے تو انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس رچے ہوئے مادّے میں کتنی مٹی ہے کتنی ہوا ہے کتنا لوہا ہے اور کس قدر کلشیم کسی نے اس سے کہا کہ تو قدرت کا پہلوٹا بیٹا ہے اور اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا۔ "کسی نے اس کو سکھایا" ابن آدم اکیلا ہی آیا ہے اور اکیلا ہی جائے گا۔ کسی نے اسے تعلیم دی . . . .

آنکھ کان ناک موند کے نام نرنجن لے
بھیتر کے پٹ جد کھلیں جد باہر کے پٹ دے

اور کسی نے تنبیہہ کی۔ دیکھ تیرے ماتھے پر "لا تفسدو فی الارض" کی چٹ لگی ہوئی ہے۔ یہ فرمان بھولا تو زمین کی بادشاہت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

مگر توبہ کیجیے یہ کان کا کچا اور من موجی مرد اپنی طبیعت کی رنگا رنگی اور تلوّن کی بدولت طوفان بدوش ہی رہا۔ اس کے اٹھائے ہوئے ہنگامے کبھی نغمۂ شادی ہوئے اور کبھی نوحۂ غم اللہ میاں کی اس بھری پری دنیا سے وہ کھلونے کی طرح کھیلتا اور انہیں سجا بنا کر پھر چکنا چور کرتا رہا۔

جلوہ گاہ آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے

مرد و عورت جب اس دنیا میں نئے نئے آئے تھے تب کوئی لڑائی تھی نہ جھگڑا۔ دونوں نے مل کر مزے مزے سے اس نوچی کھسوٹی ویران دنیا کو سنوارا "خیابان و گلزار و باغ" آراستہ کیے۔ شروع شروع میں تو زمین ایسی ان گھڑ اور بھیانک تھی کہ دیکھ کر جی دہل گیا اور ان دنوں چاند سورج پیڑ،

پہاڑ، جس تک اپنی پہنچ نہ دیکھی اس کے آگے ماتھا ٹیک دیا لیکن جب ذرا دل ٹھکانے ہوا تو مرد نے اپنے مضبوط بازوؤں سے لہلہاتے کھیت اگائے۔ جنگل میں منگل منائے عالیشان عمارتیں تعمیر کیں۔ زمین کو ٹھوکر مار کر اس کے پیٹ سے سارے خزانے اُگلوا لیے اور سب ڈھکی چھپی چیزوں کو کرید کرید کر نکالا۔ ان سے آبادیوں کو سجایا۔ عورت بھی ان سب کاموں میں برابر کی شریک رہی۔ اس نے خاندان اور قبیلوں کو جنم دیا۔ اپنے بچوں کے آرام کے لیے گھر بنائے۔ تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی۔ سوسائٹی کا نظام مرتب کر دیا۔ اور حقیقت کی خشکی میں محبت کی مٹھاس شامل کی۔

مگر جلد ہی کائنات کی وسعت، زمین کا پھیلاؤ اور اپنے بل بوتے کا پتا پاتے ہی مرد نے ہاتھ پاؤں نکالے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ چراتے چراتے آدمیوں کا رکھوالا بننے کا شوق چرایا اور مظاہر قدرت کو پوجتے پوجتے خود ہی دیوتا بن بیٹھا۔ دنیا کے اسٹیج پر وہ کبھی کنس۔ ہلاکو خاں، اور ہٹلر کے بھیس میں نمودار ہوا۔ کبھی مجنوں۔ رانجھا اور فرہاد کی شکل میں گریبان چاک خاک بسر۔ کبھی اس نے سورما بن کر گرز گاؤ سر ہلایا اور کبھی مارے نزاکت کے تاناشاہ رہ گیا۔ کبھی انسانی سروں سے برج اور مینار تعمیر کیے اور کبھی جیو ہتھیا کے ڈر سے منہ پر ڈھاٹا باندھ لیا۔ اس کی ہنگامہ پسند طبیعت نت نئے بھیس بدلتی رہی۔ فیاضی پر اتر آیا تو ایک شعر کے بدلے موتیوں سے منہ اور ہیروں سے دامن بھر دیے اور کنجوس ہوا تو ایسا کہ شائیلاک بن کر کوڑی کے بدلے خون چوس لینے پر آمادہ ہو گیا۔

جی میں آگئی تو محبت کی قربان گاہ پر تاج و تخت کیسے جان تک بھینٹ چڑھا دی اور ملک گیری کی ہوس سوار ہوئی تو باپ بیٹے تک کو زندہ نہ چھوڑا۔

آبادیاں ویرانے سے بدل کر فتح کا جھنڈا گاڑ دیا۔

کبھی بات کی تپچ میں آ کر راج پاٹ تج کر بن باس جھیلا اور کبھی عہدناموں کے پرزے ہوا میں بکھیر دیے۔

اس میں شک نہیں اس نے دنیا میں بہت بڑے بڑے کام کیے ہیں کہیں وہ کائنات کا بھید ڈھونڈھتا اور علم و حکمت کے موتی بکھیرتا رہا اور کبھی اہرام اور تاج محل تعمیر کیے۔ پہاڑ کی چٹانوں پر زندہ جاوید نقوش ثبت کیے اور کبھی مونگے موتی کی تلاش میں پاتال تک کی خبر لی۔ چاند ستاروں سے اٹکھیلیاں کرنے آسمان تک جا پہنچا۔ اور سورج کی کرنوں سے لے کر سمندر تک اور ہوا کی لہروں سے لے کر بجلی کی تڑپ تک ہر چیز سے اُس نے انسانیت کی گود بھر دی۔

اس کی کبھی نچلی نہ بیٹھنے والی طبیعت اس عالم میں ہمیشہ اُتھل پتھل کا باعث رہی۔ اللہ سے لو لگائی تو دنیا چھوڑ پہاڑوں کی کھوہ آباد کی اور دنیا کی طرف توجہ ہوئی تو اس کو فردوس بر روئے زمیں بنا کر چھوڑا۔

اللہ میاں نے بہتیرا چاہا۔ یہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھ جائے اسی لیے پہلے تو انھوں نے اس کی ناک میں عورت کی نکیل ڈالی پھر اپنے مقدس نبیوں اور اوتاروں کو بھیجا کہ قانون و شریعت کے کوڑے مار مار کر اس کا دماغ درست کر دیں۔ جب اس سے بھی کام نہ چلا تو نت نئی بلائیں نازل کیں کہ کسی طرح جی کا ابال کم ہو۔ مگر یہاں تو ٹیڑھا لگا تھا خط قلم سرنوشت کا "قدرت کا یہ شاہکار۔ نبیوں کی صحبت۔ علم کی کثرت، اور عقل کی فراوانی کے باوجود جیسا کا تیسا ہی رہا۔

لطف یہ ہے امرت ڈھونڈھنے کے لیے سمندر متھ ڈالے دھاتوں کی تلاش میں زمین روند کر پھینک دی۔ چاند ستاروں تک پہنچنے کی طلب میں آسمان تک کی پرواز کی۔ کائنات کے تمام رازہائے سربستہ طشت از بام

کر دیے مگر عورت کی پہیلی آج تک نہ بوجھ سکا۔ کبھی اسے آگ سانپ اور بچھو بتاتا ہے اور کسی وقت کہتا ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اپنی تمام حماقتوں کا الزام ہمیشہ عورت کے سر تھوپ کر اسے ناقص العقل کہتا ہے اور کبھی اس کے ایک تِل پر سمرقند و بخارا نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کبھی اسے خود ہی جلتی آگ میں جھونک دیتا ہے۔ کبھی دیوی اور ملکہ مان کر اس کے سامنے سر بسجدہ ہو گیا اور کبھی اسے زندہ زمین میں دفن کر دیا۔ اور کبھی اس سے کہتا ہے۔

جا اور راہبات کی خانقاہ میں جا رہ

کیونکہ عقل مند مرد جانتے ہیں تم عورتیں انہیں کیسا بے وقوف بناتی ہو۔

مگر بے وقوفی تو تقدیر کا لکھا بن کر ان مٹ ہو گئی وہ نہ آگ میں جل سکی۔ نہ دو گز گہرے گڑھے میں دفن ہو سکی نہ حجرہ، سمادھی اور ستونوں پر بیٹھ کر اس سے پیچھا چھوٹا اور نہ سائنس و فلسفہ کا سہارا لے کر چھٹکارا نصیب ہوا۔

ڈاکٹر اقبال نے بھی اس معاملہ میں مردوں کی نااہلیت کا اعتراف کیا ہے۔

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں

لیکن بھئی، ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس زمین و آسمان کے بیچ میں اگر مرد کا بے ہنگم بے ڈھنگا پاؤں نہ ہوتا تو یہاں دھرا ہی کیا تھا۔ یہ ساری رونق ہماہمی اور چہل پہل اسی کے دم سے ہے۔

اور آج بھی صرف عورت ہی ہے جو اپنے پرانے ساتھی کو خوب پہچانتی

ہے۔ اس نے بانسری کی مدھ بھری رسیلی تانوں سے اپنے جسم میں لرزش بھی محسوس کی ہے اور توپوں کی گھن گرج سے دل کی دھڑکن بھی سنی ہے، کسی کے جاں فزا نغموں اور محبت بھرے گیتوں سے روح میں گدگدی بھی محسوس کی ہے اور خاک و خون میں تڑپنے والوں کے لیے اپنے دل کے ٹکڑے بھی ہوتے دیکھے ہیں۔

اسے معلوم ہے کہ وہ جب چاہے اس کو اس طرح جھلا سکتی ہے جیسے ہوا گیہوں کے کھیت کو اور جب چاہے اپنے محبت بھرے ہاتھوں سے اس کے سر پر تاج بھی پہنا سکتی ہے۔

سنتی ہوں بیسویں صدی میں وہ بہت مہذب ہو گیا ہے سائنس و فلسفہ نے اس کا دماغ اتنا روشن کر دیا ہے کہ عالم انسانیت اور کائنات عالم کی حقیقت اس پر منکشف ہو چکی ہے۔ عشق خودی اور انسان کی صحیح عظمت سے واقف ہو گیا ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ دعویٰ کتنا بڑا ڈھونگ ہے درحقیقت وہ آج بھی وہیں جہاں سے چلا تھا۔ نیا علم اور نئی عقل کیسی کوئی عجب نہیں جو وہ پرانی دانش مندی سے بھی محروم ہو جائے اس میں شک نہیں۔ برہمن کی پوتھی کیڑا چاٹ چکا ہے۔ چھتری کی کمان زنگ آلودہ پڑی ہے۔ راجپوتی شان اور مغلئی آن بان داستان پارینہ بن کر رہ گئی ہیں مگر اب اس کی فطرت نے نیا رنگ و روپ اختیار کر لیا ہے اور ایسا سائنٹفک لباس تیار کر لیا ہے جسے پہن کر اس کی نظر میں چودہ طبق روشن ہو سکتے ہیں اور زمین و آسمان کا کوئی گوشہ اس کی جولان گاہ بننے سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ تعمیر و تخریب کے ہر چکر پر وہ "نیرو" بن کر بانسری بجاتا ہے۔ خود ہی علم و حکمت کے خزانے بھرتا ہے اور خود ہی ایٹمی دھماکوں سے ان کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ نو آبادیاں لبھاتا ہے اور آبادیوں کو ویران کرنا اس کا مشغلہ ہے۔

وہ آج بھی "الرّجال قوامون علی النساء" ہے اور آج بھی پتی دیوتا اور مہاتما ہے اور اب بھی اس کو ہر وقت یہی فکر لگی رہتی ہے کہ کہیں یہ بے وقوف عورت گناہوں میں پڑ کر اپنی عاقبت نہ برباد کر ڈالے لیکن خود اپنی

عاقبت کی خبر خدا جانے

موجودہ زمانے کی آگ و خون والی دنیا کا خالق صرف مرد ہے عورت بیچاری کہیں تو اینٹ چونے کے پنجرہ میں بند رہی اور کبھی بال روم میں رقص کرتی رہی۔ کسی نے اسے باورچی خانہ میں بند کر دیا اور کبھی اسے یقین دلایا گیا

آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

عالم انسانیت لرزہ بر اندام ہے اور فطرت مجسم سوال ہے کہ آخر مرد چاہتا کیا ہے اور فرشتے انگشت بدنداں ہیں۔

تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے